زنجیر

از قلم ثمرین ارشد

انتساب :

میرے ماں باپ کے نام!

جن کی لاکھوں کاوشوں کے بعد میں اس قابل ہوئی کے کچھ لکھ سکوں۔

پیش لفظ :

یہ ناول میرا لکھا جانے والا پہلا ناول ہے۔ جب میں نے یہ ناول 2025 کے شروع میں لکھا تھا ، تب میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرا یہ ناول کبھی کتابی شکل میں میرے سامنے آئے گا۔ مگر اب یہ کتابی شکل میں آپ سب کے سامنے موجود ہے۔ میں اللہ کی بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں نے اس ناول کو لکھا۔ اتنی ہی شکر گزار میں اپنے بہن بھائیوں کی بھی ہوں۔گھر کا چھوٹا بچہ ہونا مشکل کام ہے۔ اس سے بھی زیادہ مشکل اپنے بہن بھائیوں کو اپنے سے دور جاتا دیکھنا ہے۔ گھر کے چھوٹے بچے یہ باتیں سمجھ سکتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ اتنا ہی مشکل اپنے سامنے اپنے ماں باپ کو بوڑھے ہوتے دیکھنا ہے تو یہ بھی غلط نہیں ہوگا۔ ہماری زندگیوں میں کچھ لوگ ایسے ہوتے جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوں تو ہمیں ہر جگہ ، ہر شے میں دکھائی دیتے ہیں۔ان کی موجودگی کا نہ ہونا ہمیں اندر تک یہ احساس دلانے کے لیے کافی ہوتا ہے کہ ہم ان کے بغیر ادھورے ہیں۔ اور میرے نزدیک وہ لوگ میرے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں۔

اگر میں اس ناول کی بات کروں تو یہ کہانی ہے محبت کی ، ایک ایسی محبت کی کہانی جو محبت کرنے والے کو زنجیر سے باندھ کر رکھتی ہے۔ عاشق نہ آزاد ہوتا ہے اور نہ قید بس فنا ہو جاتا ہے۔ کبھی اس زنجیر سے لپٹ کر ، تو کبھی اس زنجیر پر دل ہار کر۔ لوگ کہتے ہیں مجھے اس شخص سے عشق ہوا ہے۔ میں کہتی ہوں عشق صرف اللہ کی ذات سے ہوسکتا ہے۔ انسان سے تو صرف محبت ہوتی ہے کبھی کم ، تو کبھی بے پناہ ۔ محبت ، انس ، عقیدت یہ سب انسانوں سے ہوتے ہیں جبکہ عشق تو صرف اللہ کی ذات سے ہی ہو سکتا ہے۔ یا تو اپنے اعمال سے اس عشق کو پالو یا پھر گنوا دو۔ زنجیر کہانی ہے تین ایسے کرداروں کی جو ایک دوسرے کی زنجیروں میں جکڑے تھے ، وہ عائشہ صدیقی تھی جو رہائی کی طلب گار تھی ۔ وہ میر ہادی تھا ، جو اس زنجیر سے رہا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ اذلان مصطفی تھا ، جسے اللہ نے اس کے اعمال کا اجر دیا تھا۔ اسے ذریعہ بنایا گیا تھا ، کسی کی زنجیر توڑنے کا ، کسی کا ساتھ عمر بھر نبھانے کا ، کسی کو یہ احساس دلانے کا کہ وہ کیا تھی اور کیا بنا دی گئی تھی۔ ایک اور بات اگر آپ کو میرا یہ ناول کہیں سے بھی اچھا نہ لگے تو میری لکھی اس کتاب پر غلط تبصرے مت کریے گا۔ہر کتاب ہر کسی کے لیے نہیں ہوتی۔ جن کو اس میں دلچسپی ہوگی انہیں اچھی بھی لگے گی۔آخر میں میری یہ کتاب ہر اس نئے لکھاری کے نام ، جس کو اپنی محنت ضائع ہونے کا خوف رہتا ہے۔ میں بذات خود

ایک نئی لکھاری ہوں اگر زنجیر آج آپ کے ہاتھوں میں ہے تو صرف اس لیے کیونکہ میری محنت ضائع نہیں ہوئی ، میں نے صبر سے کام لیا اور اللہ کے اوپر پورا توکل رکھا کہ جس نے مجھے اس کتاب کو لکھنے کے قابل بنایا وہ مجھے اس کتاب کو آپ تک پہنچانے میں بھی مدد دے گا۔ ہر شے زیرو سے ہی سٹارٹ ہوتی ہے۔ تو کبھی بھی مایوس نہ ہوں ، محنت اتنی خاموشی سے کریں کہ جب آپ کامیاب ہوں تو دنیا دیکھے ۔ میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ کبھی بھی کسی کی محنت ضائع نہ ہونے دے ، اور جس جس شے کے لیے آپ اپنے دن رات ایک کر رہے ہیں اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ اللہ ہر کسی کو اس کی محنت کا پھل عطا کرے۔ (آمین)

آخر میں یہ ناول پاکستان کے نام !

ثمرین ارشد

فہرست

باب 1 -------- آغاز

باب 2 -------- دیدِ یار

باب 3 -------- جنت

باب 4 -------- فریب

باب 5 -------- محبتِ صادق

باب 6 -------- بے نقاب

زنجیر پہ زنجیر ہے ،
آواز کہاں سے آئے ؟
دل قید میں رہتا ہے ،
پر خواب کہاں مر جائیں ؟
ظلمت کی فضا میں بھی ،
جلتا ہے اک امکان
خاموش شاید اک نعرہ زنجیر توڑ آئے ؟

باب 1:

~آغاز~

جانتے ہو زنجیر کا آغاز کیا ہے ؟

یہ اتنی خاموشی سے تمہارے ساتھ لپٹ جائے گی۔

تم کو تمہارے ہر راز سے ، ہر اک دن خوف دلائے گی۔

تم ہو بے بس اس کے آگے یہ یقین دلائے گی۔

جب تم پر ہو گا حاوی اس کا سایہ ہر شب و روز۔

تمہاری جان کو یہ سینے سے چیر کر دیکھائے گی۔

جب لگے گا تمہیں تم تو قید ہو اس میں اے انسان!

نکلنا چاہو گے اس قید سے ، تو تمہیں خوف دلائے گی۔

توڑ دی جو تم نے یہ زنجیر تو شکستہ کہلائے گی۔

گر نہ جو توڑ پائے تم اس کو ، تمہیں موت یاد دلائے گی۔

زنجیر کا تصور صرف لوہے کے چند حلقوں تک محدود نہیں، بلکہ یہ انسان کی زندگی کی اُن تمام قیدوں کی علامت ہے جو دکھائی نہیں دیتیں مگر ہر لمحہ اس کے وجود کو باندھے رکھتی ہیں۔ بعض زنجیریں ہاتھوں اور پیروں میں ہوتی ہیں، جنہیں دنیا دیکھ لیتی ہے، لیکن کچھ زنجیریں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کے دل، دماغ، روح اور ضمیر کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ ان زنجیروں کی نہ کوئی آواز ہوتی ہے، نہ کوئی سایہ، نہ کوئی رنگ، مگر ان کا وزن اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ انسان پوری زندگی انہیں اٹھاتا رہتا ہے۔ یہ زنجیریں جسم کو نہیں روکتیں، مگر خوابوں کی پرواز چھین لیتی ہیں۔ یہ قدموں کو نہیں باندھتیں، مگر راستوں کا یقین ختم کر دیتی ہیں۔ یہ زبان کو خاموش نہیں کرتیں، مگر سچ کہنے کی ہمت چھین لیتی ہیں۔ یہی وہ قید ہے جس میں انسان چلتا بھی ہے، بولتا بھی ہے، مسکراتا بھی ہے، مگر اندر سے ایک ایسے قیدی کی طرح جیتا ہے جسے اپنی قید کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔ دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی زنجیر کا اسیر ہے۔ کوئی دولت کی زنجیر میں بندھا ہوا ہے، کوئی شہرت کی، کوئی محبت کی، کوئی نفرت کی، کوئی ماضی کی یادوں کی،

اور کوئی مستقبل کے خوف کی۔ کچھ لوگ دوسروں کے فیصلوں کی زنجیر پہن لیتے ہیں، کچھ معاشرے کی رسموں کی، اور کچھ اپنے ہی بنائے ہوئے وہم اور غرور کی۔ وقت کے ساتھ یہ زنجیریں اتنی مانوس ہو جاتی ہیں کہ انسان انہیں اپنی قسمت سمجھنے لگتا ہے۔ پھر وہ اپنی قید کو آزادی کا نام دیتا ہے، اپنی خاموشی کو صبر، اپنی بے بسی کو تقدیر، اور اپنی شکست کو حقیقت۔ وہ بھول جاتا ہے کہ جس دن اس نے پہلی بار خوف کے آگے سر جھکایا تھا، اُسی دن اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی پہلی زنجیر پہن لی تھی۔

سب سے دردناک زنجیر وہ ہوتی ہے جو کسی اپنے کی دی ہوئی ہو۔ دشمن کی قید جسم کو تکلیف دیتی ہے، مگر اپنے کی دی ہوئی زنجیر روح کو زخمی کر دیتی ہے۔ جب اعتماد ٹوٹتا ہے، جب وفا کے بدلے غداری ملتی ہے، جب محبت کے جواب میں نفرت نصیب ہوتی ہے، تو انسان کے اندر ایک ایسی زنجیر جنم لیتی ہے جو ہر نئے تعلق پر شک کرنا سکھا دیتی ہے۔ پھر وہ ہر مسکراہٹ میں فریب دیکھنے لگتا ہے، ہر وعدے میں جھوٹ، ہر قربت میں فاصلے، اور ہر محبت میں جدائی۔ اس

کے بعد وہ کسی قید خانے میں نہیں رہتا، بلکہ خود اپنے دل کا قیدی بن جاتا ہے۔ وہ آزادی چاہتا بھی ہے تو ڈرتا ہے، کیونکہ اسے خوف ہوتا ہے کہ کہیں نئی آزادی بھی کسی نئی زنجیر کا آغاز نہ بن جائے۔ وقت ایک عجیب لوہار ہے۔ یہ ہر دکھ، ہر دھوکے، ہر شکست اور ہر خاموشی کو پگھلا کر نئی زنجیریں بنا دیتا ہے۔ کچھ لوگ ان زنجیروں کے ساتھ جینا سیکھ لیتے ہیں، کچھ انہیں اپنی پہچان بنا لیتے ہیں، اور کچھ اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ اگر ایک دن وہ زنجیریں ٹوٹ بھی جائیں تو انہیں آزادی اجنبی محسوس ہوتی ہے۔ قید کبھی کبھی اتنی پرانی ہو جاتی ہے کہ آزاد آسمان بھی خوفناک لگنے لگتا ہے۔ یہی انسان کی سب سے بڑی شکست ہے کہ وہ آزادی سے زیادہ اپنی قید پر یقین کرنے لگے۔

مگر ایک حقیقت ایسی بھی ہے جسے کوئی زنجیر بدل نہیں سکتی۔ زنجیر کی طاقت ہمیشہ قیدی کے خوف سے جنم لیتی ہے۔ لوہا کبھی انسان سے زیادہ مضبوط نہیں ہوتا، مضبوط صرف وہ یقین ہوتا ہے جو انسان کے اندر مر جاتا ہے۔ جس دن انسان اپنے خوف کو شکست دے دے، اپنے ماضی کو معاف کر دے، اپنے زخموں کو

اپنی کمزوری کے بجائے اپنی طاقت بنا لے، اور دوسروں کے فیصلوں کی بجائے اپنی آواز پر یقین کرنا سیکھ لے، اُس دن زنجیر کے تمام حلقے اپنی طاقت کھو دیتے ہیں۔ کیونکہ زنجیر کبھی ہاتھوں کو زیادہ دیر تک قید نہیں رکھ سکتی، اگر روح نے آزاد ہونے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ یاد رکھیں ، دنیا کی سب سے مضبوط زنجیر لوہے سے نہیں بنتی، بلکہ اُس سوچ سے بنتی ہے جو انسان کو یہ یقین دلا دے کہ وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ اور دنیا کی سب سے بڑی آزادی وہ نہیں کہ تمہارے ہاتھوں سے زنجیر کھول دی جائے، بلکہ وہ ہے جب تمہارا دل خوف سے، تمہارا ذہن نفرت سے، تمہاری روح ماضی سے، اور تمہارا وجود ہر اُس بوجھ سے آزاد ہو جائے جو تمہیں تمہاری اصل حقیقت سے دور رکھتا رہا۔ کیونکہ جب انسان اپنے اندر کی زنجیریں توڑ دیتا ہے، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت، کوئی ظلم، کوئی غداری، کوئی قید، اور کوئی اندھیرا اسے دوبارہ غلام نہیں بنا سکتا۔ اُس وقت وہ صرف آزاد نہیں ہوتا، بلکہ آزادی کی ایک زندہ مثال بن جاتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں زنجیر ہار جاتی ہے اور انسان جیت جاتا ہے۔

ہر پاؤں میں اک زنجیر رہ گئی،

منزل تو مل گئی مگر تقدیر رہ گئی۔

دیوارِ قید ٹوٹ گئی ایک روز تو،

دل کے مکاں میں پھر بھی اک زنجیر رہ گئی۔

ہم نے تو اپنے درد کو خاموش کر دیا،

آنکھوں کی سرحدوں پہ مگر زنجیر رہ گئی۔

اپنوں نے جب وفا کے بدلے زخم دے دیے،

ہر ایک اعتماد پہ ہر اک زنجیر رہ گئی۔

پرواز کی تمنا تو دل میں بہت رہی،

خوفِ شکست کا تھا کہ اک زنجیر رہ گئی۔

ہم نے تو رات بھر کئی پردے اتار دیے،

اک خواہشِ گزشتہ کی زنجیر رہ گئی۔

وہ شخص آزاد ہو کے بھی قید ہی رہا،

جس کی انا نہ ٹوٹی، اک زنجیر رہ گئی۔

آخر میں سمجھ اک حقیقت بھی آ گئی،

جسموں پہ قید ختم ہوئی، دل پہ اک زنجیر رہ گئی۔

☆~~~~~~~~~☆

یہ ایک بیسمینٹ نما جگہ تھی۔ بیسمینٹ کا داخلی دروازہ چھوٹا تھا۔ اگر بیسمینٹ کے اندر دیکھا جائے تو لمبی گلی نما جگہ تھی جس کے دونوں اطراف میں چھوٹے چھوٹے کمرے قطار در قطار بنے تھے۔ چھت کے اوپر جگہ جگہ سے زنجیریں نیچے کی جانب لٹک رہیں تھیں۔ سرخ بلب کی روشنی اس جگہ کو مزید وحشت ناک بناتی تھی۔ ایک مرد آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس رہداری میں سے گزرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ تھوڑا آگے قطاریں ختم ہوئیں اور ایک بڑا دروازہ واضح ہوا۔ اس آدمی نے دروازہ آہستہ آہستہ کھولا۔ بڑا سا کمرا جس کے سینٹر

میں ایک بڑا سا سٹریچر پڑا تھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ خون کے نشان تھے ۔ وہ آرام سے چلتا ہوا آیا اور ایک جانب رکھے صاف صوفے پر بیٹھ گیا ۔ وہاں روشنی کم ہی آتی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ اس کمرے میں سفید بلب لگا تھا ۔بلب کے باوجود کمرے میں کئی جگہ پر اندھیرا تھا۔جس کی روشنی اس کے آدھے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے وہ اپنے سامنے والے منظر پر مسکرا دیا۔ اس کے گال پر ڈمپل نمایاں ہوا جو کہ اس کے دائیں جانب پڑتا تھا۔

کمرے میں اندھیرے کے بیچ روشنی میں سٹریچر پر ایک لڑکا بے ہوش پڑا تھا ۔ اس لڑکے کے دونوں ہاتھ اور پاؤں اس سٹریچر سے بندھے تھے۔ پاس ایک ڈاکٹر چہرے پر ماسک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں آپریشن کرنے والے آلے جن میں سے ایک تیز Retractor (گوشت کھولنے والا آلہ) اور دوسرے ہاتھ میں سرجیکل قینچی تھی۔ اس ڈاکٹر نے سٹریچر پر موجود اس اٹھارہ سالہ لڑکے کے جسم میں بے حسی سے کٹ لگائے تھے۔ درد کی ایک چیخ اس پوری بیسمینٹ میں گونجی تھی۔ شاید یہ جگہ عادی تھی ان چیخوں کی ، یا شاید عادی بنا دیا گیا تھا۔ میز پر پڑا وجود کانپ رہا تھا ، اس کے اردگرد خون جمع ہونے لگا تھا اور آج پھر ایک ظالم کے ہاتھوں کوئی اپنی زندگی ہار رہا تھا۔ نامکمل

آرزوئیں، بے جان دل ، موت کا سماں اور پھر ایک بار کسی ظالم کے ہاتھوں ایک جان جا رہی تھی۔ جانی ہی تھی شاید اللہ نے کسی ظالم کی رسی دراز کی ہوئی تھی۔ میز پر پڑا وجود اب بے جان ہوچکا تھا ، اور کوئی بے حس کونے میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگا کر یہ سارا منظر بڑے ہی مزے سے دیکھ رہا تھا۔ ایک سکون کی لہر اس کے پورے جسم میں دوڑی تھی۔ خون۔۔۔خون تھی اس کی غذا، وہ انسانی روپ میں موجود ایک درندہ تھا۔ جسے خون ، لوگوں کا خوف اور ان کی آہ و بقا میں سکون ملتا تھا۔ وہ ایسا درندہ تھا جسے خون ملے تو غذا ، جان جائے تو سکون اور رحم۔۔۔رحم کی امید بے کار۔

"کتنا کام باقی ہے محسن ؟ ٹرک اگلے ایک گھنٹے میں لوڈ کرکے بھیجنا ہے۔" اندھیرے میں کرسی پر بیٹھا وہ جب بولا دیواروں تک نے اپنی سانسیں روک لیں ، ہر شے ساکت ، شل۔ رعب دار خاموشی چیر دینے والی آواز ، جو کسی کو بھی اندر تک ہلا کر رکھ دیتی۔ محسن نے سانس لینے کو بھی چند پل اپنا حلق تھام لیا ۔ پورے جسم میں خوف کی لہر دوڑی تھی۔ محسن کو اپنا آپ کانپتا ہوا محسوس ہوا۔ یوں جیسے اسے کسی شے کا خوف تھا۔ شاید اس نے کچھ غلط کیا تھا۔

" ج--جی--بس ہو گیا--" اس نے دم سادھے ، مضبوطی سے جواب دینا چاہا مگر نہ دے سکا۔ الفاظ تھوڑ پھوڑ کا شکار ہوئے۔ پھر اسے اپنے پیچھے میر ہادی کی سیٹی بجانے کی آواز سنائی دی۔ وہ ہل نہ سکا۔ محسن کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے سٹریچر پر موجود لڑکے کے آرگنز نکال کر مینی فریج میں رکھے۔

" غداری کا قرض میر ہادی خود اپنے ہاتھوں سے وصول کرتا ہے۔" وہ بولا تو محسن ہل نہ سکا۔ ہاتھ مزید کپکپانے لگے ، ٹانگوں میں لرزش ہوئی اور وہ اس ظالم بادشاہ کے قدموں میں بیٹھ کر گڑگڑانے لگا۔

" سر---مجھے--معاف کردے۔ میں--نے بس تھوڑے ہی پیسوں کی---ہیر پھیر کی ہے--پلیز---مجھے جانے دیں--میں---میں--زندہ رہنا--چاہتا ہوں ایسے نہ کریں--" وہ روتے روتے اپنی زنگی کی بھیک مانگنے لگا۔ اف-- میر ہادی کو اس سے چڑ ہوئی۔ اس نے محسن کو پاؤں سے پرے دھکیلا اور کمرے سے باہر آیا ۔ دو گارڈز کمرے کے باہر ہی کھڑے تھے۔ میر ہادی نے ان کی جانب دیکھا اور اشارہ کیا ۔ وہ دونوں کمرے کے اندر چلے گئے۔ کیا عجب منظر تھا ، ہر طرف موت ، خوف اور ڈر کا سماں تھا جو شاید اس پوری بیسمینٹ میں ہر وقت چھایا رہتا تھا۔ کوئی اتنا ظالم کیسے ہوسکتا تھا--؟؟ وہ اب آہستہ

آہستہ چلتا اس رہداری سے باہر آرہا تھا۔ ہر طرف خون ، چھوٹے چھوٹے کمرے کسی ظالم بادشاہ کی حکومت کا گمان ہوتا تھا۔ ایک ایسا شخص جس نے نجانے کتنی ہی زندگیاں تباہ کی تھیں۔ کتنے ہی گھر اجاڑے تھے صرف دنیاوی فائدے کے لیے وہ شخص کس کس حد تک گیا تھا۔

اسے سکون دیتا تھا لوگوں کا خوف ، ان کی آہ و بقا ، ان کے درد میں اس کو سکون ملتا تھا۔ ان کا خون بہتا تھا تو ایک اطمینان سا اس کے اندر ہوتا تھا۔ نجانے اس جگہ کتنی ہی ماوں کی گودیں اجڑی تھیں۔ کتنی ہی ماوں کے لال بغیر جنازوں کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ کتنے ہی لال تھے ، جن کو کفن تک نصیب نہیں ہوئے تھے۔

واللہ لا یھدی القوم الظلمین ○

ترجمہ : " اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔"

ظلم ایک ایسا ناسور ہے جو نہ صرف افراد کو تباہ کو تباہ کرتا ہے بلکہ پورے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ جب ایک انسان دوسرے انسان پر طاقت ، اختیار یا عہدے کے بل بوتے پر زیادتی کرتا ہے ، تو وہ صرف ایک فرد پر نہیں بلکہ پوری انسانیت پر ظلم کرتا ہے۔ ظلم کی شکلیں صرف قتل و غارت یا مارپیٹ تک محدود نہیں ہوتیں ، روز مرہ زندگی

میں بھی کسی کا حق چھین لینا ، سچ کو جھوٹ سے دبا دینا ، انصاف کے راستے بند کردینا ، آواز اٹھانے والوں کو خاموش کردینا اور خاموش تماشائی بن جانا ، یہ سب ظلم کی ہی مختلف شکلیں ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ظالم بہت مضبوط ، ناقابل شکست اور دائمی محسوس ہوتا ہے ، لیکن تاریخ ہمیں بار بار یہ سبق دیتی ہے کہ ظالم کا دور وقتی ہوتا ہے۔ نہ فرعون بچا ، نہ نمردو اور نہ ہی یزید ۔ ان سب کے نام آج بھی نفرت کی علامت ہیں اور وہ مظلوم جنہیں کچلا گیا آج وہی عظمت کا نشان بنے بیٹھے ہیں۔

" ظلم پر خاموشی ، ظلم کی شراکت داری ہوتی ہے۔"

یہ جملہ محض ایک قول نہیں ہے بلکہ تاریخ کا نچوڑ ہے۔ ظالم کا سب سے بڑا سہارا اکثر خاموشی اور خوف ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ ظالم کے خلاف آواز نہ اٹھائے ، تو وہ ظلم عام ہو جاتا ہے اور لوگ اسے معمول سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے ، کہ ہر وہ دن جس میں ہم ظلم کے خلاف نہیں بولتے ، ظالم کو مزید طاقتور بناتا ہے۔ اگر قلم خاموش ہو جائے ، زبانیں خاموش ہو جائیں تو پھر ظلم صرف بڑھتا ہے رکتا نہیں۔ مگر ظلم کی عمر کبھی لمبی نہیں ہوتی آخر کار حق ابھرتا ہے اور سچ کی کرن اندھیرے کو چیر دیتی ہے۔

" باطل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ایک جاگتا ہوا ضمیر ہوتا ہے۔"

☆~~~~~~~~~☆

آپ نے دیکھ لیا پھر بھی مروت نہیں کی

اس لیے چپ رہے ہم آپ کی منت نہیں کی

جس کو بدلے میں طلب ہے کہ اسے چاہا جائے

اس نے دھندا کیا ہے اس نے محبت نہیں کی

کراچی کا سورج پورے آب و تاب سے اپنی جھلک پورے کراچی میں پھیلا رہا تھا۔ یہ ایک گھر کے اندر موجود ایک کمرے کا منظر تھا ۔ کمرے کے اندر اندھیرا تھا اور کوئی شخص بستر پر لیٹا سو رہا تھا۔ کھڑکی سے سورج کی روشنی آہستہ آہستہ اس محل نما کمرے کو روشن کررہی تھی۔ دروازہ ناک ہوا ، اس شخص کی نیند میں خلل پڑا ۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ سورج ہلکی سی روشن کمرے کے اندر آ رہی تھی۔ مگر کمرہ آدھا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس نے ادھر اُدھر دیکھا کمرے کے اندھیرے نے اسے پریشان کیا۔ وہ فورا اٹھا اور کمرے کی لائٹ آن کی وہاں اب اسے تھوڑا سکون کا احساس ہوا۔ کمرے میں روشنی کے باعث اس کا چہرہ واضح ہوا۔ سفید رنگت ، بال ماتھے پر بکھرے ہوئے ، سیاہ آنکھیں جن میں ابھی تک پریشانی جھلک رہی تھی ، اس شخص کی جاہ لائن بہت شارپ تھی جو ہلکی ہلکی داڑھی کی وجہ سے مزید پرکشش لگتی تھی۔ شرٹ سے عاری اس کا وجود روشنی میں مزید چمک رہا تھا۔ ہاتھوں اور بازوں کی نسیں ذرا ذرا پھولی ہوئی تھیں۔ کمرے کے دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی ۔

" ہادی -- ہادی -- آپ سے ملنے آپ کے دوست ارسل آئے ہیں۔" وہ مسکرا دیا ، وہ مسکراتا تھا تو اس کے دونوں گالوں پر ڈمپل پڑتے تھے۔

" ابھی آرہا ہوں۔" اس کی زندگی کی واحد دو خوشیاں اس کی آنی جو کہ اس کے لیے ماں کا درجہ رکھتی تھیں اور اس کا دوست ارسل۔

دس منٹ بعد وہ فریش ہوکر نیچے آیا تھا ۔ سیڑھیاں اترتے ہی اس کی نگاہ نیچے جھکی تھی۔ وائٹ اور گولڈن کی تھیم کا وہ محل نما گھر تھا ۔ عالیشان بنگلے میں ہر جگہ شیشے کو آڑھا ترچھا کاٹ کر مختلف شکلوں میں مختلف جگھوں پر سجایا گیا تھا۔ گزرتے گزرتے ہادی کی

نگاہ لاونج میں پڑے اس شیشے سے بنائے گئے شیر پر پڑی ۔ لاکھوں کی مالیت کا وہ نمونہ ہر لحاظ سے ایک پرفیکٹ ڈیکوریشن پیس تھا۔ ہادی کا پسندیدہ ترین نمونہ جسے وہ The lioness کہا کرتا تھا۔ ہر کوئی اسے دا لائن کہتا تھا مگر میر ہادی کے ذہن میں اسے دیکھ کر صرف لائنس کا ہی خیال آتا تھا نجانے کیوں ؟ وہ لاونج سے ہوتا ہوئے ڈائنگ روم میں آیا۔ میز پر شیف ناشتہ لگا رہا تھا۔ میز پر ان کے دوسرے جانب ارسل مصطفی اور اس کے والد مصطفی ابراہیم بیٹھے میر گیلانی سے باتیں کرنے میں مصروف تھے ۔ ہادی اپنی کرسی کھینچ کر بیٹھا ، گیلانی نے اسے بیٹھتے دیکھا اور گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ یوں جیسے کہہ رہے ہوں آج پھر لیٹ۔۔؟

وہ مسکرایا دونوں گالوں پر ڈمپل ایک ساتھ نمایاں ہوئے۔آنی اس کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ہادی نے ان کی جانب دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔ ان کے اگے پلیٹ رکھی اور پہلے انہیں کھانا سرو کیا ۔ وہ ہمیشہ انہیں ہی سب سے پہلے کھانا سرو کرتا تھا پھر خود کھاتا تھا۔ یہ اس کی ایک عادت تھی۔ وہ ایک پچاس سالہ عورت تھیں، عمر کے لحاظ سے ان کے چہرے پر زیادہ جھریاں پڑتی تھیں۔ وہ اس گھر کی یعنی میر ہادی کی نینی تھیں جب

ہادی پیدا ہوا تھا اس وقت اس کی والدہ چشم ستار کا انتقال ہو گیا تھا اور آنی تب سے اس کے ساتھ تھیں۔

" کل والا ٹرک لوڈ کر کے بھیج دیا ، ہادی ؟ " میر گیلانی کی آواز نے خاموشی کو چیرا تو سب اس طرف متوجہ ہوئے۔

" جی بابا۔ شپ پر بھی لوڈ کروا دیا تھا۔ " کیا خوب شان بے نیازی تھی جس سے وہ یہ سب کہہ رہا تھا۔

" محسن کے گردے کیوں نکلوائے ؟ ایک تو اچھا ڈاکٹر تھا۔" اب کے وہ بولے تو ارسل اور اور مصطفی دونوں نے شاک اور غصے سے اسے دیکھا۔

" ہادی وہ میرا ڈاکٹر تھا!! یہ کیا سن رہا ہوں میں گیلانی؟ " مصطفی نے غصے سے پہلے ہادی اور پھر گیلانی کو کہا۔"

" کوئی بات نہیں مصطفی صبر کرو۔ بہت سے ڈاکٹر ہمارے انگلیوں پر ناچتے ہیں۔ خیر ہے۔" گیلانی بولے تو مصطفی ضبط کرتے وہیں بیٹھے رہے۔ پر ارسل اب بھی ہادی کو دیکھ رہا تھا۔ ہادی ہر فیصلہ ارسل سے مشورے کے بعد ہی کرتا تھا۔ اس نے ابرو اٹھا کر

ہادی کو دیکھا۔ تو ہادی نے اسے آنکھ ماری۔ پھر ایک پل میں دوبارہ ویسی ہی رعب دار آواز میں بولا جیسے گیلانی بولے تھے۔

" میر ہادی کسی کو اپنی صفائی پیش نہیں کرتا۔ میں وہی کرتا ہوں جو میرا دل چاہتا ہے۔ "

وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور ارسل کو بھی اپنے ساتھ آنے کا ارشاہ کیا۔ وہ دونوں اب جا رہے تھے ، مصطفی ابراہیم نے میر گیلانی کو غصے سے گھورا۔

"آپ نے یہ سب ہادی کے حوالے کرکے اچھا نہیں کیا۔ وہ جذباتی لڑکا ہے ، کسی دن جذبات میں آکر وہ تو ہمارے اس دھندے کو بے یار و مددگار کرکے ہی چھوڑے گا۔ اس دھندے پر ہم دونوں نے اپنی ایک عمر لگائی ہے۔ " مصطفی گیلانی کو گویا سمجھنا چاہ رہے تھے۔

" خیر اب اتنا بھی جذباتی نہیں ہے میرا بیٹا۔ اور ویسے بھی اتنی مشکل سے آرگنز پورے کر رہے ہیں ہم۔ پچھلے اے ایس پی کو جب مارا تھا تو اس کی اتنے دن تلاش جاری رہی تھی۔ اور تمہیں بھی اب اپنے ہسپتال سے زیادہ آرگنز سمگل کرنے چاہییں۔ اس مہینے بھی ٹرک میں بہت مشکل سے آرگنز سمگل کرکے کراچی بندرگاہ بھیجے ہیں۔" گیلانی نے کہتے کہتے جوس کا گھونٹ بھرا۔

" تم اپنے بیٹے پر نظر رکھو۔ اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرو گیلانی۔ محسن نے صرف تھوڑے پیسے ہی رکھے تھے اس نے اس کے آرگنز بھی بیچ دیے۔ ہر دوسرے دن نیا ڈاکٹر کہاں سے لائیں ہم ؟ " مصطفی نے گویا طنز کی۔

" اپنے بڑے بیٹے کے بارے میں کیا خیال ہے ؟ جس کو تم نے ڈاکٹر بنایا ہی اس لیے تھا کہ وہ تمہاری ان کاموں میں مدد کرے ۔ مگر وہ کم بخت تو خدمت خلق میں لگا پڑا ہے۔ اور تمہارا دوسرا بیٹا یہ ارسل ؟؟ یہ تو ہادی کے ساتھ تھوڑا ہی کام دیکھتا ہے۔ مجھ پر طنز کرنے سے پہلے اپنے بارے میں سوچو ۔" اس سے پہلے کے وہ کچھ اور سوچتے یا کہتے ان کو بیچ میں آنی نے ٹوکا ۔

" بس کرو تم لوگ ۔" آنی ۔۔ تبسم علی ۔۔ گیلانی کی دوسری بیوی اور میر ہادی کی سابقہ نینی۔ وہ ایک ایسا زہریلا سانپ تھی جس نے پیسے کی چمک دیکھ کر کیا کیا گناہ کیے تھے ۔ کسی کو کیا معلوم ؟ شاید وہ سب ایک راز تھا ، مگر راز کبھی نہ کبھی تو کھلتا ہے۔ کبھی نہ کبھی تو اپنا اصل دکھا ہی دیتا ہے۔ میر گیلانی گورنر (صدر جس کے انڈر پورا صوبہ ہوتا ہے ۔) آف کراچی تھے ۔ جبکہ مصطفی ابراہیم چیف آف ہیلتھ منسٹر تھے ۔ ان کے انڈر بہت سے ہاسپٹلز آتے تھے۔ غدار تو ہمیشہ اپنی ہی آستینوں میں پلتے ہیں نہ ؟

☆~~~~~~~~~~☆

میڈیکل یونیورسٹی اسلام آباد کا بڑا سا بوڈر سڑک کے ایک جانب لگا تھا۔ ایک شخص تھا جو بڑی ہی لاپرواہی سے چلتا جارہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں موبائل جب کے دوسرے ہاتھ میں ڈاکٹر کوٹ اور ایک stethoscope پکڑی تھی۔ جب اس شخص کے ہاتھوں میں حرکت ہوتی تو چند رگیں نمایاں ہوتی تھیں۔ بال جیل سے پیچھے کو سیٹ کیے ہوئے ، شہد رنگ آنکھیں اسے مزید خوبصورت بناتی تھیں جبکہ اس کا گندمی رنگ اس پر کافی سوٹ کرتا تھا۔ وہ ایک 26 سالہ خوبصورت مرد تھا۔ نین نقش کافی خوبصورت تھے۔

وہ یونیورسٹی کے سیمینار ہال کی طرف جارہا تھا۔ موبائل جیب میں ڈالتے وہ تیز چلنے لگا۔ شاید وہ لیٹ ہورہا تھا۔ جب وہ سیمینار ہال میں داخل ہوا تو اس نے گہرا سانس لیا۔ سٹیج پر اسی کا نام لیا جارہا تھا۔ پھر ہال میں بیٹھے تمام سٹوڈنٹس نے تالیاں بجائیں اور وہ درمیان میں سے سیڑھیاں اترتے ہوئے سٹیج کی طرف جانے لگا۔ یہ ایک بہت بڑا سیمینار ہال تھا جس کے داخلی دروازے کے اوپر لکھا تھا " پروفیسر طارق اسلامک سیمینار ہال۔" سامنے والی نشستوں پر یونیورسٹی کے چند پروفیسر بیٹھے تھے۔ آج جمعہ کا دن تھا اور نماز کے بعد ہاسٹل کے بہت سے طلبہ معمول کے مطابق ہر جمعہ کی طرح وہاں اسلام پر اس

شخص کی تقریر سننے کو تیار تھے۔ زیادہ تر ہاسٹل کے بچے ہی یہاں آتے تھے ۔ جو بچے مقامی تھے ان میں سے کچھ تو کلاسز کے بعد ہی گھروں کو نکل جاتے تھے جبکہ باقی طلبہ ہوٹلز یا فرینڈز گیدرنگز پر ۔ سیاہ شلوار قمیض میں ملبوس وہ نوجوان اب بولنا شروع کر چکا تھا کندھے پر سفید شال ڈالے وہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ کوئی ایک نظر اسے دیکھنے پر اس کا اسیر ہوسکتا تھا۔

" اسلام و علیکم ! میرا نام اذلان مصطفی ہے۔ خیر یہ تو آپ سب جانتے ہی ہیں۔ تو آج کے موضوع کی طرف آتے ہیں ۔ آج میں ایک بہت حساس موضوع لے کر آیا ہوں۔

" کرپشن۔"

بدعنوانی (Corruption) ایک ایسی سماجی، اخلاقی، معاشی اور روحانی جرم ہے جو کسی بھی معاشرے اور ریاست کی بنیادوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ یہ صرف رشوت لینے یا دینے کا نام نہیں بلکہ ہر وہ عمل بدعنوانی میں شامل ہے جس کے ذریعے کسی کا حق چھینا جائے، امانت میں خیانت کی جائے، اختیارات کا ناجائز استعمال کیا جائے، انصاف کو خریدا جائے، یا ذاتی فائدے کے لیے عوامی وسائل کو نقصان پہنچایا جائے۔ اسلام ایک

مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں عدل، سچائی اور تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید نے بار بار انسان کو فساد، ظلم، خیانت اور ناجائز کمائی سے روکا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

" إِنَّ اللہ یَأْمُرُکُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَہْلِہَا وَإِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْکُمُوا بِالْعَدْلِ."

ترجمہ: "بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔"

(سورۃ النساء، آیت 58)

حکومت، عدالت، سرکاری عہدے، عوامی وسائل اور ہر قسم کی ذمہ داری اللہ کی امانت ہیں۔ جب کوئی شخص ان امانتوں میں خیانت کرتا ہے تو وہ صرف عوام کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا بھی نافرمان بنتا ہے۔ بدعنوانی کا ایک بڑا ذریعہ رشوت اور ناجائز طریقے سے لوگوں کا مال حاصل کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

" وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ."

ترجمہ: "اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ، اور نہ ہی اسے حاکموں تک اس غرض سے پہنچاؤ کہ تم جانتے بوجھتے لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ ہڑپ کر جاؤ۔"

(سورۃ البقرۃ، آیت 188)

یہ آیت واضح طور پر اس بات کی ممانعت کرتی ہے کہ دولت یا اثر و رسوخ کے ذریعے فیصلوں کو اپنے حق میں کروایا جانا بھی ایک ایسی خیانت ہے جو آپ کو جہنم میں پہنچا سکتی ہے۔ آج کے دور میں رشوت، مالی بدعنوانی اور اختیارات کے ناجائز استعمال پر یہ آیت براہِ راست رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ مگر ہم غور کریں تب نہ ؟

بدعنوانی بھی فساد کی ایک بڑی شکل ہے، کیونکہ یہ انصاف، امن، معاشی ترقی اور عوامی اعتماد کو تباہ کر دیتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" إِنَّ اللہَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ."

ترجمہ: "بے شک اللہ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

(سورۃ المائدۃ، آیت 64)

یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فساد اور بدعنوانی سخت ناپسندیدہ اعمال ہیں۔

جب کسی ملک میں کرپشن عام ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے انصاف کا نظام متاثر ہوتا ہے۔ عدالتوں میں انصاف خریدنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سرکاری اداروں میں سفارش اور رشوت کا رواج بڑھتا ہے اور اہل افراد کی جگہ نااہل لوگ اہم عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ (چند لمحوں کے لیے اذلان کی آنکھوں کے اس کا باپ چہرہ آیا تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا اور آگے بولتا گیا۔) اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ریاست کے ادارے کمزور پڑ جاتے ہیں اور عوام کا اعتماد ختم ہونے لگتا ہے۔ معاشی لحاظ سے بدعنوانی قومی خزانے کو نقصان پہنچاتی ہے۔ عوام سے وصول کیا جانے والا ٹیکس اگر ایمانداری سے تعلیم، صحت، بنیادی ڈھانچے، پانی، بجلی اور ترقیاتی منصوبوں پر خرچ نہ ہو تو ملک ترقی کرنے کی بجائے زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ سرمایہ کار ایسے ممالک میں سرمایہ کاری سے گریز کرتے ہیں جہاں قانون کی

حکمرانی کمزور ہو اور رشوت عام ہو۔ نتیجتاً بے روزگاری، مہنگائی اور غربت میں اضافہ ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید عدل کو مضبوط معاشرے کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک پاکستان میں آج عدل کہاں ہے؟ افسوس یہ وہ ملک ہے جس کو اسلام کے نام پر آزاد کروایا گیا تھا۔ ایک بہت خوبصورت آیت پیش کروں گا۔

" إِنَّ اللہ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ."

ترجمہ: "بے شک اللہ انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے۔"

(سورۃ النحل، آیت 90)

کتنی سادہ سی آیت لگتی ہے نہ ہمیں؟ مگر ہم پھر بھی آج تک اس کا اصل مطلب نہیں سمجھ پائے۔ قرآن کو پڑھنے اور اس پر عمل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کیا ہم قرآن پر عمل کرتے ہیں؟ نہیں۔ ہم نہیں کرتے۔ جب عدل ختم ہو جاتا ہے تو ظلم بڑھتا ہے، اور جہاں ظلم عام ہو وہاں ترقی، امن اور خوشحالی قائم نہیں رہ سکتی۔ قرآنِ مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتی جب تک وہ خود اپنی اصلاح نہ کرے۔

" إِنَّ اللہ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِأَنفُسِہِمْ."

ترجمہ: "بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔"

(سورۃ الرعد، آیت 11)

یہ آیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ قومی ترقی کا آغاز انفرادی اصلاح، دیانت داری اور ذمہ داری کے احساس سے ہوتا ہے۔ اگر ہر فرد اپنے فرائض کو امانت سمجھے، رشوت، خیانت اور ظلم سے بچے، تو معاشرہ خود بخود اصلاح کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ناپ تول میں کمی اور مالی بددیانتی کی بھی مذمت فرماتا ہے:

" وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ."

ترجمہ: "تباہی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے۔"

(سورۃ المطففین، آیت 1)

مالی معاملات میں معمولی سی بددیانتی بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک بڑا گناہ ہے۔ قرآنِ مجید کی تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ دیانت داری، عدل، امانت اور حق کی پاسداری ایک اسلامی معاشرے کی بنیاد ہیں، جبکہ خیانت، رشوت، ظلم، ناجائز کمائی اور فساد اس کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ اگر کوئی قوم ترقی، امن اور خوشحالی چاہتی ہے تو اسے قرآن کے ان

اصولوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرنا ہو گا۔ جب حکمران، سرکاری افسران، تاجر، اساتذہ، طلبہ اور عام شہری سب امانت داری اور انصاف کو اپنا شعار بنا لیں گے، تبھی ایک مضبوط، خوشحال اور باوقار ریاست وجود میں آئے گی، اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا راستہ ہے۔

اللہ پاک ہم سب کو نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جب وہ خاموش ہوا تو پورے ہال میں تالیاں گونجیں ۔ وہ اب اپنی نگاہیں جھکائے سٹیج سے نیچے اتر رہا تھا۔ سامنے والی قطار میں بیٹھے پروفیسر طارق کے سامنے چند لمحے کھڑا ہوا ، ان سے سر پر پیار لیا اور ہال میں سے نکل گیا۔ وہ اذلان مصطفی تھا ، opportunities خود اس تک چل کر آتیں تھیں۔ وہ ایم بی بی ایس فرسٹ ائیر کے آخر میں تھا۔ کراچی کی میڈیکل یونیورسٹیز میں اسے مصطفی ابراہیم نے داخلہ سفارش کی بنا کر لے کر دینے کی حامی بھری تھی مگر وہ ہر گز بھی کسی بھی یونیورسٹی میں اپنے باپ کی سفارش کی وجہ سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایم کیٹ میں ٹاپ کرنے کے بعد اس کے پاس ویسے ہی بہت زیادہ opportunities تھیں اور گھر سے دور رہنے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں تھا کہ وہ کسی اور جگہ کی میڈیکل یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیتا۔

سو وہ رزلٹ کے فورا بعد ہی اسلام آباد کی میڈیکل یونیورسٹی میں میرٹ پر آگیا تھا۔ گھر۔۔گھر کے نام سے ہی اسے الجھن ہوتی تھی۔ اس گھر کا ماحول اس کے لیے اس وحشت ناک غار کی طرح تھا جہاں آپ کو کئی بھیڑیوں کے ساتھ قید کردیا جائے۔ وہ اپنے بابا کے اس خفیہ دھندے کے بارے میں افواہوں کی حد تک جانتا تھا۔ لیکن یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی ارسل یا اس کے بابا اس کام میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ اس کے بابا کی جو اہمیت سیاست میں تھی اس کے بعد تو اسے یہ سب بس افواہیں ہی لگتی تھیں۔ وہ بچپن میں زیادہ عرصہ اپنی نانی کے گھر رہا تھا جو کہ اسلام آباد میں ہی رہتی تھیں اور اس کی شخصیت میں مثبت نکھار اور اسلام سے لگاو اسی دوران آیا تھا۔ وہ ایک ایسا مرد تھا، جس پر رشک کیا جاسکتا تھا۔

یونیورسٹی کے اندر ہر سنیر پروفیسر کو ایک ایک ہال الاٹ کیا جاتا تھا۔ پروفیسر طارق جو کہ 60 سے بھی زیادہ عمر کے تھے ۔ انھوں نے اپنے ہال کو بچوں کی دین کی طرف تربیت پر مخصوص کیا تھا۔ اذلان مصطفی نے یونیورسٹی کے پہلے سال میں ہی بہت توجہ پائی تھی۔ اس کی وجہ اس کے بابا کی ریپوٹیشن تھی جبکہ دوسری وجہ ہر ماہ ہونے والے ٹیسٹ میں اس کی اعلیٰ تعلیمی کامیابی بھی تھی۔ وہ تقریبا ہر دفعہ ہی کسی نہ کسی پوزیشن پر آتا رہا

تھا۔ کچھ بچوں نے اسے سفارشات کا نام دیا جبکہ کچھ نے اذلان کی محنت کو سراہا بھی تھا۔ وہ ایک خوش اخلاق مرد تھا۔ سو اس کے کلاس میٹس اس سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ دوسری وجہ اس کا اسلام کی طرف لگاو تھا۔ بہت دفعہ پروفیسر طارق نے اسے یونیورسٹی کی مسجد میں نمازیں پڑھتے دیکھا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اسے ہال میں بولنے کا موقع بھی دیا تھا۔ ہر طالب علم کو سال میں ایک دفعہ یہ موقع دیا جاتا تھا۔ جو سب سے اچھا بولتا تھا اسے دو سال کے لیے اس ہال کا سی آر بنا دیا جاتا تھا۔ جو ہر جمعہ کو اسلام کے کسی موضوع پر بات کرتا تھا۔ اذلان پہلے دو سالوں کے لیے سی آر تھا۔ سو وہ ہر جمعہ کو وہاں بولتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی نظر میں پروفیسر طارق کے لیے عقیدت اور انس بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ انہیں اپنے باپ کا درجہ دیتا تھا۔ پروفیسر طارق بھی اسے اپنے بیٹے کی طرح ہی ماننے لگے تھے۔ استاد کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہوتی ہے؟ یہی کہ ان کا طالب علم اچھے اخلاق کا مالک ہو اور وہ تھا۔ پروفیسر طارق خود بے اولاد تھے سو اذلان کی طرف سے ملنے والی عقیدت کا ایک اثر یہ ہوا تھا کہ وہ اس سے بھی اسی طرح کی عقیدت رکھنے لگے تھے۔

☆~~~~~~~~~☆

ارسل اور ہادی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ارسل گاڑی ڈرائیور کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہادی بیٹھا تھا۔ گاڑی کراچی کی سنسان سڑکوں پر تیزی سے رواں تھی۔ وہ ٹینس کھیلنے جارہے تھے۔ (ٹینس ایک مقبول ترین کھیل ہے جو دو کھلاڑیوں کے درمیان ریکٹ اور گیند کی مدد سے کھیلا جاتا ہے۔) وہ دونوں اکثر فری ٹائم میں ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ آج بھی وہ ٹینس کا میچ کھیلنے ہی جارہے تھے، جب ہادی کا موبائل اس کی جیب میں تھرتھرانے لگا۔ اس نے موبائل جیب میں نکالا تو سکرین پر واضح ہوتے نام کو دیکھ کر اس نے الجھن سے موبائل ڈیش بوڈر پر پھینکا۔

" کس کا فون ہے؟ " ارسل نے اس کی جانب دیکھتے کہا۔

" پلوشہ کا۔۔" وہ چیڑ کر بولا۔

" اٹھا لو نہ۔ بچاری تمہارے لیے پاگل ہو رہی ہو گی۔" ارسل نے ہنستے ہوئے پلوشہ کا مذاق بنایا۔

" ہونے دو۔۔ میرا کیا جاتا ہے۔ ویسے بھی میرا دل بھر گیا ہے اب اس سے۔" ہادی نے فون دیکھا جہاں اب دوبارہ پلوشہ کی کال آرہی تھی۔ اس نے دوبارہ فون کاٹ دیا۔

اگر کراچی کے دوسرے جانب ایک چھوٹے سے گھر کا رخ کیا جائے تو ایک لڑکی صحن میں چارپائی پر بیٹھی ناشتہ کررہی تھی۔ کیچن کے اگزاسٹ سے دھواں باہر آرہا تھا۔ کیچن کے اندر ہاجرہ بی کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ گھر کا گیٹ سیاہ تھا، اس گھر کے اندر رہنے والے مکینوں کے بخت کی طرح۔۔سیاہ۔ گھر کے اندر قدم رکھا جائے تو بڑا سا صحن تھا۔ جس کے بائیں جانب کیچن تھا۔ جالی نما دیوار تھی جس کو کیچن کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا۔ دیوار کے دائیں جانب تین نارمل سے کمرے تھے۔ پینٹ کافی جگہ سے اترا ہوا تھا۔ وہ لڑکی اب موبائل پر انگلی پھیر رہی تھی۔ کھانا کھانے کے ساتھ فلم دیکھنے کی ناکام کوشش۔ کیونکہ جب تک فلم سلیکٹ کی جاتی، تب تک کھانا کھانے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ مگر معمول تو یہ روز کا تھا۔

" جلدی کھا لو عائشہ ، کالج کے لیے لیٹ ہو جاو گی۔ پیپر نہیں دینا ؟ " ہاجرہ بی اس کے پاس بیٹھتی بولیں تو اس نے ان کی جانب دیکھا گہری نیلی آنکھیں جن میں ڈوب جانے پر انسان مجبور ہو جاتا تھا۔ سیاہ لمبے بال جن کو جوڑے میں مقید کیا گیا تھا۔ سفید رنگت، نین نقش کافی خوبصورت تھے ۔ وہ میک اپ نہیں کرتی تھی شاید اسی لیے اس کا چہرہ زیادہ خوبصورت لگتا تھا۔ یہ عائشہ صدیقی کے کالج کے آخر دن تھے۔ آج اس کا سیکنڈ ائیر

کا آخری پیپر تھا۔ فرسٹ ائیر میں اس نے ٹاپ کیا تھا۔ سو اس بار سب کو اس سے کافی امیدیں تھیں۔ اس کا سب سے بڑا خواب ڈاکٹر بننا تھا ، اور اس کے لیے اس نے کافی محنت کی تھی۔ صدیقی رحمان نے اسے آگے پڑھنے کی اجازت صرف ہاجرہ بی کے کہنے پر دی تھی۔ ہاجرہ بی عائشہ کی پھوپھو تھیں ، جس وقت عائشہ کی پیدائش ہوئی تھی ، تب اس کی ماں ریم کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وقت صدیقی رحمان کا سب سے بڑا سہارا ہاجرہ بی ہی تھیں۔ ہاجرہ بی خود ان کے ساتھ ہی رہتیں تھیں۔ ہاجرہ بی کی ایک جگہ شادی کی گئی تھی ، مگر شادی کے ایک سال بعد ہی ان کے شوہر کا انتقال کار ایکسیڈنٹ میں ہوگیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے دوبارہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی وفادار رہنا چاہتی تھیں۔انہیں لگتا تھا ، اگر انہوں نے کسی اور کی طرف اس نظر سے دیکھا تو محبت میں شرک ہوگا۔

" ہر وہ انسان خسارے میں ہے ، جس نے اسلام آباد میں دل لگایا۔"

ان کی لو میراج تھی۔ وہ اپنے محبوب سے اسلام آباد میں ملی تھیں۔ پسند کی شادی پر سب کو برا لگا تھا نگر وہ ڈٹی رہیں تھیں۔ بلاآخر گھر والے مان گئے تھے۔ البتہ ان کے شوہر کے انتقال پر ، خاندان والوں کو زبانیں لگ گئیں تھیں۔ کسی نے ان کو بد نصیب کا طعنہ

دیا تو کسی نے دوسری شادی کا مشورہ، مگر وہاں بھی وہ ڈٹی ہی رہیں تھیں۔ وہ دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں اور انھوں نے نہیں کی۔ وہ وفادار تھیں، اس شخص کی جن کو انھوں نے اپنے سینے کے عین بائیں جانب ایک کمرے میں قید کر رکھا تھا۔ "محبت کا کمرہ۔" انھوں نے عائشہ کی جانب دیکھا، گہری آہ بھری ۔ دل میں سوچا کاش اس کا نصیب میرے جیسا نہ ہو۔

ان کی سوچوں کے تسلسل کو صدیقی کی آمد نے توڑا تھا، جو اپنے کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آئے تھے۔ ہاجرہ بی نے عائشہ کی جانب دیکھا جس نے ابا کی آمد پر فورا موبائل کرتے کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ وہ اپنے اکثر کرتوں کے ساتھ پوکٹ لگوایا کرتی تھی۔ وہ اپنے بابا سے بہت ڈرتی تھی۔ صدیقی رحمان کی بیوی کا انتقال عائشہ کی پیدائش پر ہوا تھا۔ وہ جب بھی عائشہ کی جانب دیکھتے تھے انہیں اپنی محبوب بیوی کی موت نظر آتی تھی۔ وہ ایک عجیب سی الجھن عائشہ سے محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے کبھی عائشہ کو وہ پیار نہیں دیا، جو وہ ڈیزرو کرتی تھی۔ وہ اس سے غصے سے ہی بات کرتے تھے۔ نجانے ان کا دل نرم کیوں نہیں پڑتا تھا۔ دوسری شادی تو خیر صدیقی نے بھی نہیں کی تھی۔ وفا تو خوب تھی اس خاندان میں، بس ساتھ نہیں تھا۔ ایک زنجیر تھی، جو ان کو اپنے

محبوب سے جدا ہونے نہیں دیتی تھی۔ صدیقی رحمان جب کبھی طیش میں ہوتے تھے تو عائشہ پر ہاتھ بھی اٹھا لیا کرتے تھے۔ ہاجرہ بی نے بہت دفعہ ان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی ، مگر وہ مانتے تب نہ۔صدیقی رحمان کبھی کبھی رات کو نشہ کر کے آتے تھے ، اور جس دن ایسا ہوتا تھا وہ عائشہ کو مار بھی لیتے تھے۔ وہ ایک بینک میں نوکری کرتے تھے ، اتنا کما لیتے تھے کہ گزارہ ہو جاتا تھا۔

حال میں واپس آئیں تو صدیقی صاحب نے ایک نظر عائشہ کو دیکھا اور غصے سے بولے۔

" ہاں ہاں چھپا لو موبائل اور دیکھو۔ اگر تمہاری فرسٹ پوزیشن نہ آئی تو رزلٹ سے دو دن بعد تیار رہنا رشتے کے لیے۔" وہ بولے تو منہ سے آگ برسی۔ جانتے تو وہ بھی تھے وہ ٹاپر تھی ، فرسٹ پوزیشن لے بھی سکتی تھی۔

" جی۔۔جی بابا۔۔۔" اس نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے کہنا چاہا مگر پھر بھی اٹک ہی گئی۔

" کم بخت !! کتنی دفعہ کہا ہے اپنی اس گندی زبان سے بابا نہ کہا کر مجھے۔ " وہ اس کے سر پر تھپڑ مارتے گھر کے گیٹ کی جانب بڑھ گئے۔

" صدیقی ناشتہ۔۔" ہاجرہ بی نے کہا تو انھوں نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

" رہنے دو ہاجرہ ۔" اپنی آواز کو لہجے کے برعکس آہستہ رکھ کر مخاطب ہوئے اور چلے گئے۔

عائشہ کچھ دیر خالی نظروں سے گیٹ کو دیکھتی رہی اور پھر خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ یہ سب تو معمول تھا، وہ عادی ہوگئی تھی اس سب کی۔ ہاجرہ بی نے اسے ترس بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کی ماں نہیں تھیں مگر ماؤں سے کم پیار بھی نہیں کیا تھا اسے۔ کاش وہ اس کی تقدیر بدل سکتیں۔

" ایسے نہ دیکھا کریں مجھے می می ۔" عائشہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ اب اپنے کالج بیگ میں اپنے پیپر کا سامان رکھ رہی تھی۔

" رو لے عائشہ۔ کسی دن اپنے دل کا غبار کیوں نہیں نکال لیتی ؟" ہاجرہ بی نے اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

" دل آنسو پی جاتا ہے می می ۔ میں کیا کروں اب تو لگتا ہے یہ غبار اسی دن نکلے گا جس دن آپ کی طرح میرا محبوب بھی مجھے چھوڑ جائے گا۔" وہ استہزایہ ہنس کر بولی۔

" تو اللہ کرے تو وہ دن جلد دیکھے جب تیرے دل کا غبار نکلے عائشہ۔" وہ بھی مذاق مذاق میں کہہ بیٹھیں۔ انہیں کسی نے بتایا نہیں تھا کہ مذاق میں کی گئی باتیں بھی تقدیر بن

جایا کرتی ہیں۔ عائشہ اپنا بیگ لے کر گیٹ کی جانب بڑھی تو ہاجرہ بی کی پیچھے سے آواز سنائی دی۔

" تم جسکے نصیب میں ہوگی ، اسکی سات نسلیں سنور جائیں گی۔

تم بہترین لڑکی ہو ، تم سے بننے والا خاندان بخت والا ہوگا عائشہ صدیقی۔

بس کسی نامحرم سے محبت نہ کر بیٹھنا ، آگ میں جھوک دے گا تجھے۔" ہاجرہ بی نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ وہ ایک پل میں ساکت ہوئی۔اسے شادی کے نام سے خوف محسوس ہوتا تھا ۔ اگر اسے ابا جیسا شوہر مل گیا تو ؟؟ لہجے کو حد درجہ نارمل رکھتے ہوئے آنکھوں کے پوروں سے نکلا آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

" باپ کی پریشانیاں اور گھر کے دکھ جن کو یاد رہتے ہیں نہ ، وہ کبھی بھی غلط راستے پر نہیں چلتے۔" وہ گھر سے باہر نکل گئی۔ آج اس کا آخری پیپر تھا۔ وہ کن باتوں میں الجھ رہی تھی۔

☆~~~~~~~~☆

باب 2:

~ دیدِ یار ~

~ کچھ اور سوچتے کیسے ، ہم اس کے سوا

دیدار یار کا تھا اور کیا دیکھتے ہم اس کے سوا

آنکھیں جب اس کی دیکھی تو جانا یہ ہم نے

کچھ تھا ہی نہیں اس کی نیل آنکھوں کے سوا

رکشے سے باہر نکل کر عائشہ نے ایک نظر اپنے سامنے موجود کالج کو دیکھا اور گہری آہ بھرتی وہ اندر داخل ہوئی۔ سیاہ چادر کالج یونیفارم پر لیے وہ اپنے مخصوص حلیے میں تھی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں کسی کی تلاش میں تھیں ، پھر اس نے ایک لڑکی کو دیکھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایمان رحیم۔ عائشہ کی دوست اور اس کے لیے بہنوں سے بڑھ کر۔ ہماری زندگی میں کچھ دوست ایسے ہوتے ہیں جہنیں اگر ایک نظر دیکھ لیا جائے تو گھر کے سارے مسائل بھول جایا کرتے ہیں۔ ایمان رحیم اس کے لیے ایک ایسی ہی دوست تھی۔ ہر غم اسے دیکھ کر دل کے کونے میں جا سوتے تھے۔ دو سال ، بس دو سال ہی تو ہوئے تھے ان کی دوستی کو اور انہوں نے ان دو سالوں میں بہت مزے کیے تھے۔ اپنی کالج لائف کھل کر جی تھی۔ ایمان کے بابا اسی کالج میں

پروفیسر تھے ۔ مالی طور پر وہ ایک اچھی فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کی ملاقات کالج کے پہلے دن ہی ہوئی تھی اور نجانے کب ان کی بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ انہیں خود بھی علم نہیں ہوا۔ وہ دونوں ساتھ ہوتیں تھیں ، تو دنیا سے بے خبر رہا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ سوچا کرتیں تھیں کہ کاش ! ان کے گھر ساتھ ساتھ ہوتے۔ شاید ایسا ہر دوست نے کبھی نہ کبھی سوچا ہوتا ہے۔ دوست وہ نہیں ہوتا جو صرف خوشیوں میں ساتھ نظر آئے، بلکہ وہ ہوتا ہے جو خاموشی میں بھی آپ کی تکلیف سمجھ لے۔

سچا دوست زندگی کا وہ قیمتی تحفہ ہے جو ہر مشکل راستے کو آسان اور ہر اداسی کو ہلکا کر دیتا ہے۔ وقت بدل جائے، حالات بدل جائیں، لوگ بدل جائیں، مگر اگر دوستی سچی ہو تو اس کے رنگ کبھی مدھم نہیں پڑتے۔ کچھ رشتے خون سے بنتے ہیں، مگر دوستی ایک ایسا رشتہ ہے جو دل سے جڑتا ہے، اعتماد سے پروان چڑھتا ہے اور وفا سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ ایسے دوست زندگی کی سب سے خوبصورت نعمت ہوتے ہیں، جن کی موجودگی ہر سفر کو یادگار بنا دیتی ہے۔

" کیسی تیاری ہے پیپر کی ؟ " ایمان نے اس کے پاس آتے پوچھا ۔

" ٹھیک ہے۔ تمہاری؟ " عائشہ نے اس کی جانب دیکھا۔

" کچھ بھی نہیں آتا یار ، کیا بتاؤں میں تمہیں کچھ بھی نہیں پڑھا میں نے۔" وہ منھ کے زاویے بناتے بولی تو عائشہ ہنس دی۔

" پاگل نہ بناو مجھے ، ہر بار اچھے مارکس آتے ہیں تمہارے ۔" عائشہ نے اسے چھیڑا۔ اگلے چند منٹ بعد وہ دونوں ایگزام ہال میں دھڑا دھڑ شیٹس بھر رہیں تھیں۔

" ٹینس کھیلنے چلیں ؟ " ایمان نے عائشہ کی جانب دیکھتے پوچھا۔

" نہیں یار۔ مجھے تو کھیلنا بھی نہیں آتا ٹینس۔ تمہیں عادت ہے نہ کھیلنے کی تم ہی کھیلا کرو۔" عائشہ اپنی چادر درست کرتی بولی۔

" چلو نہ عائشہ بعد میں کچھ کھانے بھی چلیں گے۔ پلیز یار ، آخری دن ہے ساتھ آج تو کالج کا ، پتہ نہیں دوبارہ جلدی ملاقات ہوگی بھی یا نہیں بعد میں تو ہم دونوں ایم کیٹ کی تیاری میں لگ جائیں گے پلیز یار۔۔" ایمان اسے ایموشنل بلیک میل کر رہی تھی۔

" اچھا یار۔۔فائن۔۔چلو۔" عائشہ نے موبائل آن کیا۔ اب وہ ایم کیٹ کے نوٹس نکال رہی تھی۔

"یار بعد میں دیکھ لینا ابھی چلو۔" ایمان نے اس کے ہاتھ سے فون لیا اور اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

اگلے چند منٹ بعد وہ دونوں ایمان کے بابا کی گاڑی میں بیٹھی تھیں جو ایمان نے اپنے بابا کی اجازت سے ان سے لی تھی۔ عائشہ کھڑکی کے باہر گزرتے روڈ کو دیکھ رہی تھی جب وہ سوچوں کی گہری کھائی میں کھونے لگی۔

ایمان کے بابا کتنے اچھے ہیں۔ مجھے یقین نہیں ہوتا میرے بابا مجھ سے پیار کیوں نہیں کرتے۔ اگر وہ پیدا ہو گئی تھی تو اس کی ماں نہ مرتی۔ کاش ان کی جگہ وہ مر جاتی ، تو آج یہ سب نہ ہوتا۔ اس کا باپ اس سے اتنی نفرت نہ کرتا۔ اس کا باپ نشہ نہ کرتا۔ کاش !! اسے بھی وہ پیار ملتا جو ایک باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔ ہاجرہ بی پیار تو کرتی تھیں پھر بھی ماں نہیں لگتی تھیں۔ ماں کا خانہ تو خالی ہی رہ گیا تھا۔ باپ تھا ، جس کی محبت نہ ہونے کے برابر تھی۔ باپ کی محبت کے نام پر بس بچپن سے مار ہی کھائی تھی۔ وہ عائشہ صدیقی تھی اور وہ اپنے باپ کی محبت بھری ایک نظر کو ترستی تھی۔ ذہن کی سکرین پر ماضی کے لمحے ورق گردانی کرنے لگے تو اس نے آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

" بے حیا باپ سے زبان چلاتی ہے؟؟ " عائشہ اس وقت 10 سال کی تھی۔ جب ایک دن انجانے میں وہ اپنے بابا کی قمیض استری کر رہی تھی اور وہ اس سے جل گئی تھی ۔ وہ سہم گئی تھی ، اس نے قمیض چھپا دی۔ جب ابا کو پتا چلا تو وہ طیش میں آگئے تھے۔ انہوں نے اسے بہت مارا تھا۔ جب اس معصوم بچی نے روتے روتے کچھ کہنا چاہا تو وہ اسے بے حیا کہنے لگے۔ کیا کوئی اپنی 10 سالہ بیٹی کو بے حیا کہہ سکتا ہے؟

باپ جسے بیٹی اپنی دعاؤں کا محور ، تحفظ کا سایہ اور محبت کا پہلا چہرہ سمجھتی ہے۔ جب وہ ہی ظلم و جبر کی علامت بن جائے تو بیٹی کی دنیا آباد ہونے سے پہلے ہی اجڑ جایا کرتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ چھن جاتی ہے ، خواب مر جاتے ہیں اور اعتماد کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ وہ باپ جس کے قدموں کی چاپ پر بیٹیاں دوڑ کر سینے سے لگ جاتی ہیں، اگر اس کے لہجے میں طنز ، ہاتھ میں سختی اور آنکھوں میں نفرت ہو تو بیٹی کے دل میں زندگی کے لیے محبت باقی نہیں رہتی۔

" بیٹیاں پھول ہوتی ہیں ، اگر انہیں کانٹوں میں تبدیل کر دیا جائے تو خوشبو صرف نفرت کی رہ جاتی ہے۔"

ایک باپ جب بیٹی کے جذبات کو کچلتا ہے ، اس کی خواہشوں کو قید کرتا ہے یا محض اپنی غیرت ، انا یا غصے کی تسکین کے لیے اس پر ظلم کرتا ہے تو وہ نہ صرف باپ کے رشتے کی توہین کرتا ہے بلکہ رب کے عطا کردہ عظیم امانت کا بھی حق ادا نہیں کرتا ہے۔

معاشرے میں یہ ظلم کئی شکلوں میں جاری ہے۔ کبھی بیٹی کو تعلیم سے محروم کر دیا جاتا ہے ، تو کبھی کم عمری میں زبردستی شادی کر دی جاتی ہے۔ کبھی غیرت کے نام پر قتل کر کے اور کبھی صرف اس لیے نفرت دے کر وہ بیٹا نہیں ہے۔

" جہاں بیٹی ہونے کو جرم سمجھا جائے ، وہاں انسانیت دفن ہو جاتی ہے۔"

باپ کے ہاتھوں کی سختی جب محبت سے خالی ہو تو بیٹی کی ذات میں زخم بن کر اترتی ہے۔ ایسے زخم کو جو نہ تو کسی کو دکھائے جا سکتا ہیں اور نہ ہی سنائے جا سکتے ہیں۔ دل کا غبار من و من ہو جاتا ہے۔ اگر باپ کا رشتہ ہی ایسا ہو تو بیٹی دنیا کے رشتے کو جھوٹا تصور کرنے لگتی ہے۔ بیٹی تو ویسے ہی باپ کے زیر سائے پروان چڑھنے والی شاخ ہوتی ہے ، اسے کاٹنے والا صرف درخت کو کمزور کرتا ہے۔

" غصہ رشتے تباہ کرتا ہے۔"

معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ اسے اکثر " گھریلو مسئلہ " کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں۔ ظلم پر خاموشی، ظلم کی شراکت داری ہوتی ہے۔ اگر ہم بیٹی کو واقعی رحمت سمجھتے ہیں تو اس رحمت کی حفاظت کرنا ، اس کی تربیت محبت سے کرنا اور اس کو جینے کا حق دینا ہر باپ کی بنیادی ذمے داری ہے۔

" عائشہ ؟؟ عائشہ؟؟ " ایمان کی آوازوں نے عائشہ کی سوچوں کا تسلسل توڑا تھا۔ گاڑی کب کی پریکٹس ائیرا کے باہر کھڑی تھی ۔ یہ ایک پلے گرونڈ جسی پروفیسنل ٹینس کھیلنے کی جگہ تھی۔ جہاں ہر تھوڑے فاصلے پر ایک منی ٹینس ائیرا بنا تھا۔ ہر جگہ پر کہیں لڑکے اور کہیں لڑکیاں کھیلنے میں مصروف تھے۔ٹینس دنیا کے مقبول ترین کھیلوں میں سے ایک ہے، جو دو کھلاڑیوں یا دو ٹیموں کے درمیان کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل میں ریکیٹ اور گیند کی مدد سے گیند کو جال کے اوپر سے مخالف کے کورٹ میں اس انداز سے مارا جاتا ہے کہ وہ اسے واپس نہ کر سکے۔ ٹینس تیز رفتار، مہارت، جسمانی فٹنس اور ذہنی یکسوئی کا بہترین امتزاج ہے۔ یہ کھیل کھلاڑیوں میں نظم و ضبط، برداشت، فوری فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور کھیل کے جذبے کو فروغ دیتا ہے۔ دنیا بھر میں ٹینس کے بڑے مقابلے لاکھوں شائقین کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں، اور یہی خصوصیات اسے ایک دلچسپ اور منفرد

کھیل بناتی ہیں۔ پاکستان میں البتہ نوجوانوں کا اس کھیل طرف رجحان تھوڑا کم ہے ۔ مگر ہے ضرور اور جو اسے کھیلنا پسند کرتے ہیں وہ اس کی اہمیت اچھے سے جانتے ہے۔ ایمان عائشہ کا ہاتھ تھامے اب اندر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ کاونٹر سے دو ریکیٹ لیے ، ٹکٹ کروائی اور اندر داخل ہوئیں ۔ گو کہ باہر سے بھی اندر کا منظر دکھائی دیتا تھا مگر اندر آنے پر ہر شے واضح ہوتی گئی۔ وہاں زیادہ تر امیر فیملیز سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں اور لڑکے آتے تھے۔ عائشہ نے ان کے برعکس سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی سو وہ سب سے منفرد لگ گئی تھی۔ اسے برا لگا۔ لڑکیوں نے چھوٹے چھوٹے کافی ماڈرن کپڑے پہن رکھے تھے۔ عائشہ کی نیلی آنکھوں نے ایک منظر قید کیا تو وہ کنفیوژن کا شکار ہوئی۔ ایک پریکٹس ائیرا کی حدود کے باہر کافی لڑکے اور لڑکیاں جمع تھے۔ جو اونچی آوازوں میں ایک نام کا نعرہ لگا رہے تھے۔ " ہادی "۔

ایمان اور عائشہ بھی اس جانب آئے تو منظر واضح ہوا۔ گرونڈ کے چاروں جانب سفید جالی لگی تھی اور اسی جالی سے ایک جانب دروازہ بنایا گیا تھا۔ اندر کا منظر کچھ حد تک مختلف تھا۔ دو لڑکے ٹینس کھیل رہے تھے۔ ان کے بیچ کی جالی بھی سفید رنگ کی تھی مگر وہ نرم تھی۔ ٹروز شرٹ میں ملوس وہ دونوں لڑکے جیتنے کی کوشش کررہے تھے۔ ان میں

سے ایک لڑکے نے سیولیس بنین کی طرح کی سیاہ شرٹ پہن رکھی تھی۔ جسم پر سردی کا موسم ہونے کے باوجود کافی پسینہ تھا۔ البتہ دھوپ کی وجہ سے شاید پسینہ آگیا ہو۔ اس لڑکے کی آنکھیں سیاہ تھیں۔ نا چاہتے ہوئے بھی عائشہ اسے بہت غور سے نوٹ کر رہی تھی۔ کہیں تو دیکھا تھا اسے مگر کہاں ؟؟ پھر اس نے گہری سانس لی اور سکور کی جانب دیکھا۔ وہ لڑکا جیت چکا تھا۔ وہ کافی اچھا ٹینس کھیلتا تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ گولی کی رفتار سے کیسے مقابل شخص کو ٹینس میں مات دی جاتی ہے یہ میر ہادی سے بہتر کون جان سکتا تھا ؟ لڑکے اور لڑکیوں نے ہادی کے نعرے مزید بلند کردیے تو اس نے گہری آہ بھری ۔ اس کا نام شاید ہادی تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں اب اندر داخل ہوکر اس کے اردگرد کھڑے تھے۔ عائشہ نے کوئی دلچسپی نہ دیتے ہوئے چہرہ دوسری رخ موڑ لیا۔ اس کی نظریں ایمان کو تلاش کر رہیں تھیں۔ وہ اتنا کھو گئی تھی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ ایمان کب گئی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا ایمان اسے نظر نہ آئی تو وہ واپس اس جانب مڑی جہاں پہلے دو لڑکے میچ کھیل رہے تھے۔ ایک پل کے ہزارویں حصے میں وہ ساکت ہوئی۔ میر ہادی کی نگاہیں اس کی نیلی آنکھوں سے ٹکرائی۔ ہر شے نے دم سادھ لیا۔ وقت کی ہلتی سوئیاں تھم گئی۔ وہ اب اسی جانب بڑھ رہا تھا۔ عائشہ کو پہلو سے ایمان کی آواز آئی تو اس نے رخ موڑ لیا۔ نظروں کا تسلسل ٹوٹا ہر شے واپس اپنے نظام پر چلنے لگی۔ اس مڑ کر

دوبارہ دیکھا تو اس لڑکے کے اردگرد پھر سے لڑکے لڑکیاں جمع تھے۔ مگر وہ اسی جانب دیکھ رہا تھا۔

" یار سوری گھر سے فون تھا کیا ہم پھر کسی دن چلیں کھانا کھانے ؟ گھر پر گیسٹ آ رہے ہیں۔" ایمان نے عائشہ سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں چلی گئیں۔

" ہادی کبھی تو مجھے جیتنے دیا کرو یار۔ " میچ کے چند گھنٹوں بعد وہ دونوں پینٹ ہاوس کی بالکنی میں بیٹھے تھے۔ رات کے اس پہر سردی بہت زیادہ تھی۔ اس کے برعکس ہادی ارسل کے ساتھ وہاں بیٹھا تھا۔

" میں کیا کروں اگر تمہیں ٹینس کھیلنا نہیں آتا ؟ " وہ سگریٹ کو لبوں سے دبائے بولا۔ارسل کو تیوری چھڑی ۔

" اچھا یار چھوڑو یہ سب۔ مجھے یہ بتاو کل جو لڑکیوں کا کنٹینر بھیجنا ہے سپین اس کا کیا کرنا ہے ؟ ایک دو لڑکیاں کم ہیں۔ وہ انگریز کا بچہ پورے پیسے نہیں دے گا اگر ایک بھی لڑکی کم ہوئی۔" ارسل نے اس کی جانب دیکھتے کہا جو اب تک بالکنی کی ریلنگ پر بازو جمائے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

" اتنی اتنی سی بات کے لیے مجھے تنگ نہ کیا کرو۔ اٹھا لو کہیں سے بھی۔ " ہادی چیڑ کر بولا۔

" خیر تو ہے ہادی ؟ جب سے ٹینس میچ کھیل کر آئے ہیں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کن سوچوں میں گم ہو تم ؟ " ارسل کا چہرہ غور سے دیکھا۔

" نیلی آنکھیں۔۔" وہ ہولے دے بڑبڑایا۔

" ہیں ؟؟؟ کس کی آنکھیں؟ کیا بول رہے ہو ہادی؟؟ " ارسل نے غور سے دیکھا وہ جو ابھی تک کسی سوچ میں گم تھا۔

" وہاں ایک لڑکی کو دیکھا میں نے۔۔اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔" اب کی بار ہادی نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔ ہادی کی آنکھوں میں نمی تھی۔ نمی ؟؟؟ اور وہ بھی میر ہادی کی آنکھوں میں؟؟؟ یہ کیسے ممکن تھا۔

" ہادی۔۔کیا بات ہے یار۔۔" ارسل پریشان سا اس کے پاس کھڑا ہوا۔

" اس کے آنکھیں نیلی تھیں ، میری ماں جیسی۔ اتنے سالوں میں کبھی بھی مجھے میری ماں کی یاد نہیں آئی۔ مگر آج اس کی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے پہلی بار اپنی ماں یاد آئی ہے

ارسل۔ اگر ان کا جوانی کا کوئی روپ ہوتا تو وہ وہی روپ ہوتا۔" ہادی نے وہ ایک آنسو کا قطرہ اپنی گال سے صاف کیا۔ اس سے زیادہ خود کو نرم کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ اسے اپنے باپ کا ہر حکم ماننا تھا۔ اس کی پرورش ہی اس طرح کی گئی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ غلط ہے مگر اس سے بھی زیادہ غلط وہ زنجیر تھی جو بچپن سے ہی میر گیلانی نے اس کے گلے میں ڈال رکھی تھی۔ وہ خود بھی تو ایک قیدی ہی تھا۔ اپنے باپ کی نا تمام خواہشات کا ایک ایسا قیدی جسے بس ان کے حکم پر چلنا تھا۔ کچھ زنجیریں نظر نہیں آتی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ آپ کو کمزور ضرور کرتی ہیں۔ وہ ارسل کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

اسے سکون چاہیے تھے۔ جو شاید اسے تنہائی میں ہی ملتا۔ کمرے کا دروازہ بند کرکے اس نے گہری سانس لی اور سائیڈ ٹیبل تک آیا۔ دراز کے اندر اس کی ماں کی تصویر موجود تھی۔ اس نے غور سے دیکھا اور ان کی تصویر میں جو ایک شے میر ہادی نے اتنے سالوں میں نہیں دیکھی تھیں وہ ان کی نیلی آنکھیں ہی تھیں۔ وہ بیڈ پر لیٹ گیا، کتنے ہی لمحے کمرے کے اندھیرے میں چھت کو تکتا رہا۔ پھر ایک پل میں اس کی آنکھوں کے آگے کہ وہ نیلی آنکھوں والی لڑکی لہرائی تو کب وہ نیند کی گہرائیوں میں جا سویا اسے علم نہیں ہوسکا۔ اسے

sleep paralysis تھا۔ وہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی رات کو صرف دو یا تین گھنٹے ہی سو پاتے تھا۔ اسے جلدی نیند نہیں آتی تھی۔ وہ کئی کئی گھنٹے خالی نظروں سے دیواروں کو تکتا رہتا تھا۔ آج وہ بنا کسی سوچ کے سکون سے سو گیا تھا۔

اس کی بند آنکھوں کے آگے پھر سے اس لڑکی کا چہرہ لہرایا تو نیند میں اس کے ہونٹ ہلکی مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔

ایک زنجیر تھی جس کا ان کرداروں کی زندگی میں اضافہ ہونے والا تھا۔

ایسی زنجیر جسے کچھ لوگ " محبت " کہتے ہیں۔

مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ۔۔

" کچھ محبتیں کوفہ سے آیا ہوا خط ہوتی ہیں۔۔!!

بھروسے کا قتل۔

ظلم کی انتہا۔

اور فقط ماتم۔"

☆~~~~~~~~☆

زمین پر ہر طرف اندھیرا چھایا تھا۔ ایک لڑکی تھی جسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ کافی دیر سے بے ہوش تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھاما اور اٹھ کر بیٹھی۔ آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولی تو سامنے کا منظر واضح ہوا۔ وہ لمحے بھر میں ساکت ہوئی۔ وہ پلوشہ تھی اور اس کے سامنے اس جیسی بہت سی لڑکیاں تھیں۔وہ سب ایک کنٹینر میں تھیں یعنی۔۔؟؟ ان کو غیر قانونی طور پر کسی دوسرے ملک میں سمگل کیا جارہا تھا۔ اس نے سوچنے کی کوشش تو جو آخری بات اسے یاد وہ یہ تھی کہ وہ کل میر ہادی سے ملنے اس کے پینٹ ہاوس گئی تھی۔ اور۔۔اور اب۔۔؟؟ اب وہ کہاں تھی ؟ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آیا۔ یک دم سے اس کا تنگ کنٹینر میں سانس لینا مشکل ہوگیا۔ تو کیا وہ افواہیں سچ تھیں ؟ میر ہادی وہ سب غیر قانونی کام کرتا تھا ؟؟؟

" ہادی !! " وہ اتنی زور سے روتے ہوئے چیخی کہ کنٹینر میں موجود لڑکیاں جو پہلے ہی خوف زدہ تھیں مزید سہم گئیں۔ پلوشہ نے اپنا ہاتھ کافی زور سے اس کنٹینر پر مارا۔ اتنی شدت سے کہ اس کے ہاتھ سے خون نکلنے لگا۔ مگر وہاں پروا کس کو تھی ؟ کنٹینر کے اندر مختلف جگھوں پر چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ جن کو شاید آکسیجن کی فراہمی کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس نے سوراخ سے باہر کی جانب دیکھا تو اس کے پورے وجود میں خوف کی لہر

دوڑ گئی۔ وہ سب لڑکیاں ایک بحری جہاز پر تھیں۔ جس کے چاروں اطراف پانی ہی پانی تھا۔ چند لمحے بعد اسے محسوس ہوا جیسے کوئی پانی جیسی چیز اس کے ہاتھ سے زمین پر گر رہی ہو۔ تب اس نے اپنے ہاتھ سے نکلتے خون کو دیکھا۔ جینے کی ایک آس نے اس کو اٹھنے پر مجبور کیا تھا۔ آج پلوشہ نے خود سے ایک وعدہ کیا تھا۔ وہ میر ہادی سے اپنا انتقام ضرور لے گی۔ اگر وہ اپنا بدلہ نہ لے سکی تو خود کو اسی سمندر میں فنا کر کے گی۔

پلوشہ نے نظریں پھیر کر کنٹینر میں دیکھا۔ سامنے ایک لڑکی بیٹھی پانی کے اس گلاس کو غور سے دیکھ رہی تھی جو کنٹینر کے اندر ہی ایک کولر کے پاس موجود تھا۔ اس نے وہ گلاس تھاما اور پوری قوت سے کنٹینر کے فرش پر دے مارا۔ وہ کرچی کرچی ہوا۔ اس لڑکی نے نم آنکھیں لیے گلاس کے ایک حصے کو اٹھایا اور لگلے ہی پل وہ کنٹینر میں تڑپ رہی تھی۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ پلوشہ نے اس منظر کو کسی پتھر کے بدت کی طرح دیکھا تھا۔ شاید وہ کوئی غیرت والی لڑکی تھی۔ جس نے اپنی عزت لٹ جانے کے ڈر سے خودکشی کرنا زیادہ ٹھیک سمجھا تھا۔ خون اس کے اردگرد پھیل چکا تھا۔ پلوشہ کے ہاتھ سے نکلتا خود اس لڑکی کے خون میں جمع ہونے لگا۔ وہ لڑکی اب تڑپ نہیں رہی تھی۔ وہ مر چکی تھی۔

مگر بچتا کون تھا ؟؟؟ جو زندہ رہتی تھیں ان کی رعح مر جاتی تھی۔ شاید پلوشہ جانتی تھی کہ اسے بھی بہت درد سہنے ہونے ہو گے۔ لیکن وہ ہار نہیں مان سکتی تھی۔ اسے جینا تھا۔وہ ہار مان کر اپنے جیسی کئی پلوشہ کو مرنے نہیں دے سکتی تھی۔

اسمگلنگ۔۔کیا ہے اسمگلنگ؟؟ جو ہمارے معاشرے کو تباہ کر رہا ہے۔یہ سب محض ایک کہانی تک نہیں ہے۔ 2018 ء سے 2019 ء کے درمیان لڑکیوں کو اسمگلنگ کے ذریعے چائنا سمگل کیا گیا تھا۔ جن میں 629 پاکستانی لڑکیاں شامل تھیں جن کو چائنیز آدمیوں کو بیچا گیا تھا۔ کبھی فیک جوبز کا جھوٹ بول کر تو کبھی کسی اور طرح یہ سب ہمارے ملک پاکستان میں ہوتا رہا تھا اور شاید آج بھی ہوتا ہوگا۔

اسمگلنگ صرف غیر قانونی مال کی منتقلی نہیں، بلکہ یہ ایک سوچ ہے۔ ایک نظام ہے۔ ایک گھناونا دھندہ ہے۔ جو خاموشی سے قوموں کی بنیادیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ اسمگلنگ کرنے والے ہاتھ نہ صرف قانون شکن ہوتے ہیں بلکہ انسانیت شکن بھی ہوتے ہیں ۔ وہ لوگ جو پیسہ بنانا کی حواس میں ملک کی معیشت، معاشرت اور سالمیت کو داو پر لگا دیتے ہیں۔ وہ دراصل اس قوم کے مجرم ہوتے ہیں۔ جن کی شکلیں تو عام انسانوں جیسی ہوتی ہیں لیکن دل میں زہر اور ہاتھوں میں ایسی زنجیریں ہوتی ہیں جن سے دو دوسروں کے حق

کو قید کر لیتے ہیں۔ یہ ملک صرف عمارتوں، بازاروں اور سڑکوں کا نام نہیں ہے۔ اس کے سینے میں ایسی خاموش قبریں بھی دفن ہیں جن پر کبھی کتبے نہیں لگتے۔ یہاں کچھ مائیں آج بھی دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی ہیں، کیونکہ اُن کی بیٹیاں روزگار، بہتر مستقبل یا نکاح کے خواب دکھا کر اُن سے چھین لی گئیں۔ اُن خوابوں کے بدلے صرف خاموشی، پردیس اور بے نام قید ملی۔

دو ہزار اٹھارہ اور دو ہزار انیس کے اُن دنوں کی گرد ابھی تک مکمل طور پر نہیں بیٹھی، جب پاکستان کی سیکڑوں لڑکیوں کو جعلی شادیوں کے ذریعے چین لے جانے کے الزامات سامنے آئے۔ سرکاری تحقیقات میں سینکڑوں ناموں کی فہرست سامنے آئی، مگر ہر نام صرف ایک عدد نہیں تھا، وہ کسی ماں کی دعا، کسی باپ کی امید اور کسی بہن کی ہنسی تھی۔ کچھ واپس آئیں تو اُن کی آنکھوں کی روشنی بجھ چکی تھی، اور کچھ کی واپسی کی خبر بھی نہ آسکی۔ کہتے ہیں انسان کا دل محبت کا گھر ہوتا ہے، مگر جب معاشرہ ضمیر بیچ دے تو دل صرف خون پمپ کرنے والا عضو رہ جاتا ہے۔ گردے، جگر، آنکھیں اور جسم کے دوسرے اعضا انسان کی بقا کے لیے بنائے گئے تھے، مگر غربت، لالچ اور جرائم کی تاریک دنیا میں یہی اعضا بھی کبھی کبھی تجارت کی زبان بن جاتے ہیں۔ پاکستان میں غیر قانونی اعضا کی

خرید و فروخت کے واقعات اور عالمی سطح پر ایسے جرائم کی موجودگی اس حقیقت کی یاد دہانی ہیں کہ جب انسان کی قیمت لگنے لگے تو جسم بھی بازار کا حصہ بن جاتا ہے۔

یہ صرف عورتوں کی اسمگلنگ نہیں، انسانیت کی اسمگلنگ ہے۔ جب ایک بیٹی کو سرحد پار بھیجا جاتا ہے تو اُس کے ساتھ صرف اُس کا جسم نہیں جاتا، اُس کی زبان، اُس کی دعائیں، اُس کی پہچان اور اُس کے خواب بھی جلاوطن ہو جاتے ہیں۔ جب کسی مجبور انسان کو یہ احساس دلایا جائے کہ اُس کے جسم کا ہر عضو ایک قیمت رکھتا ہے، تب اصل میں اُس کی روح کو قسطوں میں قتل کیا جا رہا ہوتا ہے۔

افسوس یہ نہیں کہ مجرم موجود ہیں ۔ افسوس یہ ہے کہ بعض اوقات عدالت تک پہنچنے سے پہلے گواہ خاموش ہو جاتے ہیں، فائلیں گرد میں چھپ جاتی ہیں، اور شور مچانے والے تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر تاریخ جانتی ہے کہ ہر ظلم اپنے پیچھے ایک گواہی چھوڑ جاتا ہے۔ ہر آنسو ایک دستاویز ہے، ہر خاموشی ایک بیان ہے اور ہر گمشدہ عورت اس معاشرے کے ماتھے پر ایسا سوال ہے جس کا جواب آنے والی نسلیں بھی مانگیں گی۔

کاش ایک دن ایسا آئے جب کسی ماں کو اپنی بیٹی کے واپس آنے کے لیے دروازہ کھلا نہ چھوڑنا پڑے، جب کسی غریب کو اپنے جسم کے اعضا اپنی غربت سے کم قیمتی نہ لگیں اور

جب عورت کو انسان سمجھنے کے لیے کسی قانون، کسی مہم یا کسی خبر کی ضرورت نہ رہے۔ اُس دن شاید زمین بھی سکھ کا سانس لے گی، کیونکہ انسان کی سب سے بڑی حرمت اُس کا وجود ہے، اور سب سے بڑا جرم اُس وجود کو سودا بنا دینا۔

☆~~~~~~~~~☆

اسلام آباد کی سردی میں کافی حد تک اضافہ ہوگیا تھا۔ یہ ایک ہوسٹل کا منظر تھا۔ کوئی شخص کمرے کی کھڑکی کے پاس نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ شہد رنگ آنکھوں والا وہ شخص اپنی مثال آپ تھا۔ اس شخص کے چہرے پر بے پناہ نور تھا۔ سیاہ بال ماتھے پر رف سے تھے۔ ان کو سیٹ کرنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ سیاہ شرٹ کے نیچے سیاہ ہی ٹوزر پہن رکھا تھا ۔ وہ اب سجدے میں تھا۔ دونوں جانب سلام پھیر کر ، اب وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا چکا تھا۔ یہ عشاء کی نماز کا وقت تھا۔ سارا دن یونیورسٹی کے میڈیکل کلینک میں پریکٹس کر کے وہ بہت تھک چکا تھا۔ سو فیصل مسجد جانے کی بجائے اس نے کمرے میں ہی نماز پڑھی تھی۔ وہ اکثر عشاء کی نماز فیصل مسجد میں ادا کیا کرتا تھا۔ اسے وہاں سکون محسوس ہوتا تھا ۔

" یا اللہ ! میرے بابا اور بھائی کو سیدھے رستے پر چلا دے۔آمین۔" وہ یہی دعا مانگا کرتا تھا۔ اسے کسی چیز کی طلب کبھی محسوس ہوئی ہی نہیں تھی۔ سو وہ ہمیشہ اپنے گھر والوں کے کیے ہدایت مانگتا تھا۔ وہ اذلان مصطفی تھا۔ کوئی فرشتہ نہیں تھا وہ۔ بس ایک با کردار مرد تھا۔ جس کی آنکھوں میں حیا اور چہرے پر نور تھا۔

اذلان نماز طے کر رہا تھا جب کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ زور زور سے پیٹا ۔ اس کے پہلے سال کے پیپر ختم ہو چکے تھے ۔ سو ہوسٹل کے کافی بچے چھٹیاں گزارنے اپنے گھروں کو جا چکا تھے۔ اس کا دل نہیں تھا سو وہ اپنے بابا کے کہنے پر بھی واپس گھر نہیں گیا۔ اسے اس گھر میں بے سکونی محسوس ہوتی تھیں۔ اس نے دروازہ کھولا سامنے اس کا ہوسٹل فیلو عثمان کھڑا تھا۔

" کیا ہوا ؟ " اذلان نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پریشان لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کافی پسینا بھی تھا۔ شاید وہ دور سے بھاگ کر آیا تھا۔

" اذلان۔۔اذلان وہ۔۔یونیورسٹی کا کوئی سٹوڈنٹ ۔۔۔اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ ہوسٹل ہال 5 میں ۔۔وہ سیریس۔۔" عثمان نے گہرے گہرے سانس لیتے کہا۔ اس نے شاید کہیں سے خبر سنی تھی اور فورا ہی اذلان کے پاس بھاگا آیا تھا۔ میڈیکل یونٹ ہاسٹل

ہال 5 سے کافی دور تھا۔ زیادہ قریب شخص جسے عثمان جانتا تھا جو اس معاملے میں مدد کر سکتا تھا وہ اذلان مصطفی ہی تھا۔

اذلان نے اس کی بات سنتے ہی اپنے کمرے سے باہر بھاگا تھا۔ اگر ایک منٹ کی بھی دیر ہو جاتی یا وہ کوتاہی کرتا تو کوئی اپنی زندگی ہار سکتا تھا۔ اذلان نے اپنے ہال 3 سے باہر نکلتے نکلتے فرسٹ ایڈ باکس جلدی میں اٹھا لیا۔ وہ بہت تیز پاگلوں کی طرح فرسٹ ایڈ تھامے دوڑ رہا تھا۔ ڈاکٹرز یہی کرتے ہیں۔ انہیں یہی کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اپنی پروا سے عاری کسی ایسے شخص کی جان بچانا جسے آپ جانتے تک نہ ہوں۔ ایک اچھا ڈاکٹر یہی کرتا ہے۔ اس لمحے اذلان مصطفی نے بھی وہی کیا تھا۔ وہ اتنا بھاگا اسکا بھی سانس عثمان کی طرح پھول چکا تھا۔ دن ٹائم تو پر ہوسٹل کی شٹل چلا کرتی تھی۔ سٹوڈنٹس آسانی آ جا سکتے تھے۔ مگر رات کو ان کا آنا جان ممنوع تھا۔ یہ ایک بہت بڑی یونیورسٹی تھی۔ اندر کافی فاصلے پر ایک ایک ہوسٹل تھا۔ اذلان مصطفی اتنا بھاگا کہ قدم تھک گئے۔ مگر وہ پھر بھی بھاگتا رہا۔ یہ جاب اللہ کی امانت تھی۔ وہ اس میں خیانت نہیں کرسکتا تھا۔

☆~~~~~~~~☆

جب وہ ہال 5 میں داخل ہوا تو اسے اوپر والے پورشن سے لڑکوں کا شور سنائی تھی۔ اس کا دل لمحے بھر کو ساکت ہوا۔ کہیں اس نے دیر تو نہیں کردی ؟؟ اسے خوف محسوس ہوا۔ اسے لگا وہ گر جائے گا ، رو دے گا۔ مگر اس نے خود پر قابو پایا اور بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ گرا ۔ وہ پھر اٹھا۔ تیز تیز چلنے لگا۔ وہ پھر گرا۔ کسی اجنبی کو کھو دینے کا خوف بڑا تھا ۔ اس سے بھی بڑا خوف اللہ کی امانت میں خیانت کرنے کا تھا۔ اس کی کہنی چھل گئی خون رسنے لگا۔ وہ پھر سے اٹھا اور اوپر کی جانب بھاگا۔ جب اوپر پہنچا تو ایک کمرے کے باہر کئی لڑکے جمع تھے ۔ مگر اندر کوئی نہیں جارہا تھا۔ اس خوف محسوس ہوا۔ بے پناہ خوف۔۔دل کانچ کی طرح ٹوٹنے کے قریب تھا۔ وہ آگے بڑھا اور لڑکوں کے بیچ میں راستہ بنا کر کمرے کے اندر جھانکا۔ وہ پل بھر میں ریزہ ریزہ ہوا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا ۔ کمرا صاف تھا اور خالی بھی۔ اس نے دھڑکتے دل کو قابو کرتے ہوئے اپنا رخ ان لڑکوں کی جانب کیا۔ چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

" وہ۔۔۔وہ خودکشی۔۔والا لڑکا۔۔؟؟؟؟ " اس نے اپنا سانس قابو میں کرتا کہا اور اس کے سینئر ائیر کے چند لڑکے ہنسنے لگے۔ اس نے نا سمجھی سے ان کی جانب دیکھا۔

" کوئی خودکشی نہیں ہوئی یار۔ ہم تو بس پرینک کر رہے تھے نئے ٹاپر کے ساتھ۔ کیوں ٹاپر صاحب کیسا لگا پرینک ؟؟؟ تم تو سیریس ہی ہو گئے یار۔" وہ احمد تھا سکینڈ ائیر کا ایک سٹوڈنٹ ۔ اس کے الفاظ تھے اور اذلان مصطفی نے سکون کا سانس لیا۔ وہ چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔ مگر اس کے دل میں کچھ باقی رہ گیا تھا۔ کیا تھا وہ ؟؟ کسی کو کھونے کا خوف !! ایسا خوف جو اسے نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

وہ اب آہستہ آہستہ چل کر اپنے ہال کی طرف واپس جارہا تھا۔ راستے میں اسے عثمان نظر آیا جو اب اس سے سوری کر رہا تھا۔اس نے سر کو خم دیا اور آگے بڑھ گیا۔ ہزاروں سوچیں اس کے ذہن میں گردش کرنے لگی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ کسی غیر کی موت سے اسے اتنا خوف محسوس ہوگا۔ مگر اسے ہوا تھا۔ پھر اس نے سوچا اگر اس جگہ اس کے گھر والوں میں سے کوئی ہوتا تو کیا ہوتا ؟؟ وہ تو مر جاتا۔ اسے مزید خوف محسوس ہوا۔ اس کا دل اتنے زوروں سے دھڑک رہا تھا کہ سینہ چیرنے کو تیار تھا۔ کمرے میں آتے ساتھ جو اس نے پہلا کام کیا وہ اپنی مام کو کال کرنا تھا۔ اس نے کال ملائی بیل گئی مگر کسی نے نہیں اٹھایا۔ اسے مزید خوف محسوس ہوا۔ آج سے پہلے اسے اپنا آپ اتنا بزدل کبھی نہیں لگا تھا۔ اس سب میں وہ یہ تک بھول گیا تھا کہ اس کی کہنی سے خون بہہ رہا تھا۔

اس نے دوبارہ کال ملائی ، بیل جانے لگی فون اٹھایا گیا تو اس کے سانس میں سانس آئی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ جان نکل بھی گئی۔

" ہیلو۔۔بیٹا کیسے ہو۔۔؟ " وہ رامین مصطفیٰ کی آواز تھی۔ مگر جس نے اسے خوف میں مبتلا کیا تھا وہ ان کی آنسو بھری آواز تھی ۔ جسے وہ حد درجہ نارمل رکھنے کی کوشش کر رہیں تھیں۔

"آپ۔۔آپ کیسی ہیں مام؟ " وہ بولا تو اس کی اپنی آواز بھی بھر آئی۔ وہ کبھی کسی کے سامنے نہیں روتا تھا۔ وہ صرف اللہ کے روتا تھا ، اسے لگتا تھا وہ کسی اور کے سامنے روئے گا وہ کبھی خود کو خوف کی اس زنجیر سے آزاد نہیں کرسکے گا۔

" ۔۔۔پتا نہیں۔۔۔" وہ بولیں تو اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ وہ جانتا تھا بابا مام کے ساتھ صحیح سے بات تک نہیں کرتے تھے۔ چند لمحے دونوں ماں بیٹے کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔

" میں نانی جان سے ملا تھا۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہیں مام۔" اذلان نے خوف سنبھلتے کہا ۔

" مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کرنا اذلان۔" وہ جب بولیں تو ان کے لہجے میں نمی تھی۔

وہ کبھی اپنے بچوں پر توجہ نہیں دے پائی تھیں۔ یا شاید تب دینا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ ایک میڈیکل کلاس فیملی سے تھیں۔ ان کی شادی لو میراج تھی۔ چار دن کا سہانا خواب اور پھر گھپ اندھیرا۔ مصطفی نے ان پر کئی دفعہ چیٹ کیا تھا۔ مگر فرق انہیں بھی نہیں پڑا ۔ وہ پیسے میں کھیلنے لگی تھیں، اور پیسے کا خمار بڑھا تھا۔ بچوں کی پرورش پر نہ مصطفی نے توجہ دی اور نہ ہی امینہ نے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ارسل اپنے کی صحبت میں رہنا لگا اور ان جیسا ہی بنتا گیا۔ جب کہ اذلان مصطفی کا دل گھر کے نام سے ہی روٹھ گیا۔ وہ بچپن سے ہی کئی کئی ہفتے اپنی نانی کے گھر اسلام آباد گزارنے لگا۔ آسیہ اچھی عورت تھیں، وہ اذلان کو ہر شے کے بارے میں تفصیل سے سمجھایا کرتی تھیں۔ اسے اسلام کی طرف لانے میں سب سے بڑا ہاتھ آسیہ کا ہی تھا۔ وہ ان سے بہت محبت اور عقیدت رکھنے لگا تھا۔ وہ کئی منٹ فون ہاتھ میں لیا بیٹھا رہا ، امینہ کی بات کا جواب نہیں دیا۔

" اب کیا فائدہ مام۔۔" وہ بولا تو اب کے اس کا لہجہ الجھن کا شکار تھا۔

'' گھر آ جاو اذلان۔۔ میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ارسل نے تو میری بات تک نہیں سنی ۔ باپ نے بیت کچھ سکھا دیا ہے اسے ، وہ کہتا ہے میں یہی ڈیزور کرتی ہوں۔'' ان کا لہجے میں خوف تھا ، درد تھا۔

'' مام۔۔میں نے آپ کو معاف کیا۔ مگر میں واپس نہیں آنا چاہتا۔ مجھے لگتا ہے میں واپس آؤں گا تو مجھے ہر وہ رات یاد آئے گی جب میں آپ کی اور بابا کی محبت کو ترستا رہا تھا۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔'' اذلان نے فون کاٹ دیا۔

وہ کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے فیصل مسجد واضح نظر آتی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر خالی نظروں سے فیصل مسجد کو تکتا رہا۔ چند منٹوں پہلے والا وہ پرینک یاد آیا۔ پھر اپنی مام کی فون کال۔ ہر شے ذہن کی سکرین پر رنگ بھرنے لگی تو وہ بے دلی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خوف کہیں دور جا سویا۔ اس بات سے بے خبر خوف کی زنجیریں آپ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتیں۔

والدین کے ہاتھوں ٹوٹنے والی اولادوں کے دل جڑنے کے قابل رہتے ہے بھلا ؟

☆~~~~~~~~~☆

اسلام آباد کا سورج اگلی صبح کافی زور و شور سے نکلا تھا۔ سردی آج کم تھی۔ وہ گہری نیند میں تھا سورج کی کرن کھڑکی سے ہوتی ہوئی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو شہد رنگ آنکھیں سورج کی روشنی میں چمک اٹھیں ۔ اذلان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ شاید اسے بخار تھا۔ اسے حیرت ہوئی وہ آج فجر کی نماز کے لیے نہیں اٹھا تھا۔ اس افسوس ہوا تو کپڑے بدل کر وہ فیصل مسجد جانے کے لیے یونیورسٹی کی ہی بس میں بیٹھ گیا۔اس کے پاس گاڑی تھی مگر آس پاس جانے کے لیے وہ یونیورسٹی کی ہی بس استعمال کرتا تھا۔ اسے قضا نماز ادا کرنی تھی۔ اگر ادا نہ کرتا تو سارا دن بے سکون جاتا۔

فیصل مسجد اس کے ہوسٹل کے سامنے ہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تو مسجد کا منظر واضح ہونے لگا۔ وہ اسلام آباد کی مصروف ترین مساجد میں سے ایک تھی۔ بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہو گا کہ اکثر لوگ اسلام آباد آتے ہی اس شاہکار کو دیکھنے تھے۔ اسلام آباد مساجد کا شہر نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ ایک مسجد اسلام آباد کو ایک ایسی شان سے نوازتی تھیں کہ وہ اپنی مثال آپ تھی۔ مسجد کے باہر ہی جوتے رکھنے کی جگہ موجود تھی۔ اس نے اپنے جوتے اتارے اور اندر داخل ہوا۔ آج دھوپ تھی ، سو مسجد کے جس حصے میں اوپر چھت

نہ تھی اس حصے سے فرش کافی زیادہ گرم تھا۔ اتنا گرم کے آپ کے پیپر جل جاتے۔ البتہ جس جگہ پر سفید پتھر سے گلی نما لائن بنائی گئی تھی وہاں کا پتھر دھوپ کے باوجود بھی ٹھنڈا تھا۔

وضو کر کے وہ اندر نماز والی جگہ پر آیا۔ قضا نماز کی نیت باندھی اور کھڑا ہو گیا۔ نماز پڑھنے لگا تو رات کے منظر واضح ہونے لگے ۔ اس نے نماز پر توجہ دینی چاہی مگر دے نہ سکا۔ آج نجانے کیا ہوگیا تھا۔ بمشکل اس نے نماز ادا کی ۔ اسے سکون نہیں آیا۔ اذلان مصطفی کو نماز میں سکون نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے اپنے لیے بھی شاک تھا۔ وہ جب بھی پریشان ہوتا تھا نماز یا قرآن پاک ہی پڑھتا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تو وہ اندر ہی دوسری جانب مسجد پر بچھے قالین پر بیٹھ گیا۔ یہ مسجد کا اندر کا حصہ تھا۔ اوپر علیشان جھومر لٹک رہے تھے۔ اس نے اسلامی کتابوں والے ایک ریک میں سے قرآن اٹھایا ۔ اس کی جلد برون رنگ کی تھی۔ وہ قرآن کافی پرانا تھا لیکن بہت اچھی حالت میں آج بھی وہیں موجود تھا۔ وہ اکثر اسی قرآن کو پڑھا کرتا تھا۔ اس نے قرآن کو ہاتھ میں تھاما اس کو چاروں جانب سے چوم کر ماتھے سے لگایا۔ یہ اس کی عادت کا حصہ تھی۔ اذلان نے قرآن کھولا ، اس کے صفحہ پرانے ترج کے تھے۔ کافی نفاست تھیں ان میں اور اگر غور کیا جائے تو ہر پرانی

شے میں ایک نفاست ہوتی تھی۔ ہم نے ہر شے کو ماڈرن کرنے کے چکر میں اصل حسن کھو دیا ہے۔ اس نے سورہ الفجر کھولی ، وہ سورہ اس کی پسندیدہ ترین سورت تھی۔ وہ اب پڑھ رہا تھا۔

سورۃ الفجر کتنی خوبصورت ہے نہ یہ ؟ جس کا مطلب ہی " اطمینانِ قلب کا سفر" ہے۔

سورۃ الفجر صرف ایک سورت نہیں، بلکہ انسان کی پوری زندگی کا آئینہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ قوموں کے عروج و زوال، انسان کی آزمائش، دنیا کی حقیقت، اور آخر میں ایک مومن کی کامیاب منزل کو بیان فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ○ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ○

(سورۃ الفجر: 15–16)

ترجمہ :

''پس انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اسے آزماتا ہے، پھر اسے عزت دیتا اور نعمتیں عطا کرتا ہے، تو وہ کہتا ہے: 'میرے رب نے مجھے عزت دی۔' لیکن جب وہ اس کی آزمائش کرتا ہے اور اس کا رزق محدود کر دیتا ہے، تو وہ کہتا ہے: 'میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔'''

یہ آیات ہمارے ایک بڑے غلط فہم عقیدے کی اصلاح کرتی ہیں۔ ہم اکثر سمجھتے ہیں کہ دولت، کامیابی اور آسائش اللہ کی خاص محبت کی علامت ہیں، اور تنگی یا مشکلات اللہ کی ناراضی کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ واضح فرماتے ہیں کہ دونوں ہی آزمائشیں ہیں۔ اصل سوال یہ نہیں کہ ہمارے پاس کتنا ہے، بلکہ یہ ہے کہ ہم ہر حال میں اللہ کے کتنے وفادار ہیں۔ پھر سورت ہمیں معاشرتی انصاف کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ یتیم کی عزت، مسکین کی مدد، اور مال کی محبت پر قابو پانا ایمان کا حصہ ہے۔ عبادت صرف نماز تک محدود نہیں، بلکہ بندوں کے حقوق ادا کرنا بھی اللہ کی رضا کا راستہ ہے۔

اور پھر سورت اپنے سب سے حسین انجام پر پہنچتی ہے ۔ جس کی کچھ آیات کچھ یوں ہیں:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ○ وَادْخُلِي جَنَّتِي ○

(سورۃ الفجر: 27–30)

ترجمہ :

"اے اطمینان پانے والی جان! اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پھر میرے بندوں میں شامل ہو جا، اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

"نفسِ مطمئنہ" وہ دل ہے جو حالات سے نہیں، اللہ سے وابستہ ہوتا ہے۔ خوشی ملے تو شکر کرتا ہے، مصیبت آئے تو صبر کرتا ہے، گناہ ہو جائے تو توبہ کرتا ہے، اور ہر حال میں اپنے رب پر بھروسا رکھتا ہے۔ اس کا سکون دنیا کے بدلتے حالات سے نہیں، بلکہ اللہ کی یاد سے پیدا ہوتا ہے۔

سورۃ الفجر ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ دنیا کی کامیابیاں عارضی ہیں، لیکن اللہ کی رضا ہمیشہ کے لیے ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی کو تقویٰ، عدل، رحم اور اخلاص کے ساتھ گزارے، تو اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت لمحہ وہ ہوگا جب اللہ خود اسے پکارے گا:

ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○

کتنی عظیم کامیابی ہوگی کہ بندہ اپنے رب سے راضی ہو، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ رب اپنے بندے سے راضی ہو۔ یہی سورۃ الفجر کا اصل پیغام ہے: دنیا امتحان ہے، لیکن انجام ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن رہتے ہیں۔

جب اذلان قرآن پڑھ کر فارغ ہوا تو اس نے اپنے قدم مسجد سے باہر کی جانب موڑ لیے۔ ظہر کی اذان میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ سو مسجد سے باہر آگیا تھا۔ لاشعوری طور پر اس نے موبائل آن کیا جو شاید اس نے صبح اٹھ کر آف کیا تھا۔ موبائل پر اس کی مام کی پانچ میس کالز تھیں جو کہ صبح 8 بجے کے قریب کی تھیں ۔ اسے حیرت ہوئی ، وہ اسے کالز نہیں کیا کرتی تھیں۔ وہ تو اسے مہینوں تک کالز کرتی ہی نہیں تھیں۔ نجانے کس خیال کے تحت انھوں نے کل رات اس سے معافی مانگی تھی۔ اس نے نمبر ملایا تو جواب نادر۔۔وہ گھبرا گیا ، تو پاس پڑے بینچ پر بیٹھ گیا۔ کال دوبارہ ملائی تو جواب نادر۔۔اس سے پہلے کے وہ دوبارہ کال ملاتا اس کے نمبر پر مصطفیٰ (اذلان کے بابا) کی کال تھی۔ اس نے کال اٹھائی ، فون کان سے لگایا۔

" اسلام و علیکم بابا۔۔سب خیریت۔۔؟ " وہ گویا اپنی ماں کا پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر اتنی بے تکلفی کبھی ان کے رشتے میں تھی ہی نہیں۔

'' میں تو ٹھیک ہی ہوں۔ تمہاری کا ماں کا کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ اتنی سرد مہری سے بولے تھے کہ اسے دکھا سا لگا۔ دل ڈوب کر ابھرا تھا۔

'' کیا۔۔۔کیا ہوا ہے مام کو ؟؟؟ '' دل تیزی سے دھڑکنے لگا ۔

'' اس نے اپنی نس کاٹنے کی کوشش کی ہے آج صبح ہسپتال میں ہے۔ یہ عورت مجھے جینے نہیں دے گی۔ میں کوئی سیکنڈل برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ابھی تو میڈیا کو پتا نہیں چلنے دیا۔ اگر ان کو پتا چک گیا تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ یہ بد بخت عورت جینے نہیں دے گی مجھے۔ '' وہ بول رہے تھے۔ مگر اذلان مصطفی پل بھر میں مٹی کا ڈھیر ہوا تھا۔ دل ٹوٹا تھا اور اتنی زور سے ٹوٹا تھا کہ شاید ہی کرچیاں بچ پاتی۔ اس کے ماں باپ جیسے بھی تھے ، اسے ان سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کی فیملی تھی۔ یک دم اپنی ماں کے بارے میں ایسی بات سننا وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

'' تم آ جانا آج کراچی واپس۔ پلین کی ٹاکٹ کروا دی ہے تمہاری اذلان میں نے۔ '' وہ کہتے فون رکھ گئے۔ نہ اس سے دکھ بنٹا ، نہ اس کی سنی۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی کرتے تھے۔ کاش ! وہ کبھی اذلان مصطفی کی بھی سن لیتے تو کتنا ہی اچھا ہوتا۔

چند لمحے بعد اس کا موبائل تھرتھرایا۔ مصطفی نے اسے ٹکٹ واٹس ایپ کردی تھی۔ اسے کراچی واپس جانا تھا۔ اسے اپنا دل بھاری سا محسوس ہوا۔ اس نے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا۔ دن کے 1 بجنے والے تھے۔ اس کو اتنے گھنٹوں بعد بتایا گیا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اس سے رابطہ کرسکتے تھے۔ مگر نہیں کیا۔ اس مزید دکھ ہوا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

کاش! وہ ان کی سن لیتا۔

کاش! وہ ان کے کہنے پر کل ہی کراچی چلا جاتا۔

کاش! وہ آج صبح موبائل آف نہ کرتا۔

اب اس کے پاس پچھتاوے کے علاوہ اور کچھ نہ بچا تھا۔ انسان کو کاش لفظ اس وقت یاد آتا ہے جب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کاش کی نوبت ہی نہیں آنے دینی چاہیے۔ زندگی کسی نہ کسی مقام پر ہر کسی لے لیے تلخ ہوتی ہے۔سب کچھ ٹھیک ہونے کی امید میں انسان کتنا کچھ سہہ لیتا ہے۔

☆~~~~~~~~~☆

باب 3:

~ جنت ~

میری ماں نے مجھ کو۔۔

بڑے خسارے میں رکھا۔۔

جب تھا وقت محبت کا۔۔

اس نے مجھ کو خود سے جدا رکھا۔۔

جب وقت جدائی کا تھا آیا۔۔

اس نے مجھ کو۔۔

اپنی زنجیروں سے باندھ رکھا۔۔

جنت تھی وہ میری تو۔۔

اس نے قدموں کو اپنے۔۔

مجھ سے چھپا رکھا۔۔

عائشہ کے ایم کیٹ کی تیاری اس کے کالج میں ہی شروع کروا دی گئی تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے کالج جاتی اور دوپہر 3 بجے تک واپس آتی۔ اس کا زیادہ وقت پڑھائی میں ہی

گزر رہا تھا۔ آج وہ کالج سے واپسی سے لائبریری رک گئی تھی۔ اسے کچھ کتابیں خیریدنی تھیں ۔ کتابیں اس کا پہلا جنون تھیں۔ انہیں دیکھتے دیکھتے کب 3 سے 4 بج گئے اس علم ہی نہیں ہوسکا۔ کتابوں سے بھرے ریکس پر انگلیاں پھیرتے وہ جو خوشی محسوس کرتی تھی ویسی خوشی اس نے صرف کتابوں میں ہی پائی تھی۔ چھوٹے ہوتے ہو وہ اکثر سنتی تھی کہ کتابیں انسان کی بہترین دوست ہوا کرتی ہیں۔ مگر اس کا مطلب اب جا کر اسے سمجھ آیا تھا۔ کتابیں اس کی بہترین دوست ہی تھیں۔ اس کے واحد سکون کا ذریعہ جب وہ کوئی کتاب کھولتی تھی تو وہ خود کو ایک ایسی دنیا میں پاتی تھی جہاں سکون ہی سکون تھا۔ تقریبا 4 بج 10 منٹ پر وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تھی۔ مگر سامنے ہی ابا کو اس کا انتظار کرتے دیکھ کر وہ پل بھر کو پتھر کی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی غصے سے اس کی جانب بڑھے تھے۔ ان کے پاس سے شراب کی بد بو آرہی تھی۔ اسے سانس لینے میں دقت ہوئی۔

"کہاں تھی تو ہاں !؟؟" وہ اتنا غصے سے چیخے تھے کہ وہ رونے لگی۔

" انسان ہر کسی سے اپنے حق کے لیے لڑ سکتا تھا سوائے اپنوں کے۔ اپنوں کے دیے زخم گہرے لگتے ہیں۔ وہ ایسے کانچ کی مانند ہوتے ہیں کہ ہاتھ لگاؤ تو کٹ جائے گا، محبت چاہو تو روح فنا ہو جائے گی۔"

" ابا۔۔۔ می۔۔ میں۔۔لائبریری۔۔۔" وہ اٹک اٹک کر بولی۔ چہرے سے سارا خون نچوڑنے لگا۔

" جھوٹ بولتی ہے نہ تو۔۔ پڑھائی کے نام پر جھوٹ بولتی ہے کم بخت!! " وہ غصے سے چیخے اور اس کے گال پر اتنی زور سے تھپڑ رسید کیا کہ وہ فرش پر گر گئی۔ اس کے نچلے ہونٹ سے خون نکلنے لگا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے اپنوں نے اس کی روح پر بڑے ظلم کیے تھے۔

" صدیقی نہ کر بچی ہے وہ!! پڑھنے ہی گئی تھی! " ہاجرہ بی نے عائشہ کے آگے آکر کھڑی ہوگئی تھیں۔

"تیرے لاڈ نے بگاڑ دیا ہے اسے ہاجرہ ۔ اسے کہہ دے اگر پاس نہ ہوئی تو یاد رکھے کسی ایسے بیا دوں گا اسے کہ اپنے نصیب کو روتی رہے گی یہ بد بخت ساری زندگی۔" وہ غصے سے کہتے وہاں سے چلے گئے اور وہ وہیں روتی رہ گئی۔ بے بس۔۔ لاچار۔۔ بھلا ماں باپ کے آگے بھی آج تک کوئی بیٹی اپنی جنگ جیت پائی ہے؟

" ہاجرہ بی---میں پاس ہو جاؤں گی---پکا---میں پڑھنا چاہتی ہوں--انہیں کہے مجھے پڑھنے دیں--پلیز--پلیز---" وہ روتے روتے منت کرنے لگی ، ہاجرہ بی نے اسے فرش سے اٹھا کر صحن کی چار پائی پر بیٹھا دیا۔

" عورتوں کی توہین تو بے دین گھروں میں ہوتی ہے۔ صالحین کے گھروں میں تو عورتیں ملکہ ہوتی ہیں۔"

اس کے دائیں پیر میں گرنے کی وجہ سے نیل پڑ گیا تھا۔ فرش پر اس جگہ سے سیمنٹ تھوڑا ہوا تھا جو اس حصے کو ذرا کھردرا بنا رہا تھا۔ اسی لیے زور سے گرنے کی وجہ سے اس کے پاوں میں گہرا جامن رنگ کا نیل پڑ گیا تھا۔ اسے درد محسوس تو ہوئی تھی مگر وہ درد اپنے روح پر لگے رخموں سے زیادہ تکلیف دہ نہیں تھی۔ وہ زخم زیادہ گہرے تھے جو اس کے باپ نے اس کی روح پر لگائے تھے اور جانتے ہے سب سے بڑے زخم اس وقت بھرتے محسوس ہوتے ہیں جب اولاد کو گھروں سے محبتیں نہ ملے تو وہ وقتی سہارے ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ جو انہیں کئی حسین خواب دیکھاتے ہیں مگر دراصل وہ وقتی چاہتوں کی ایک ایسی زنجیر ہوتی ہے جس سے نکلنا ہمارے لیے مشکل ترین ہو جاتا ہے۔ یہ زنجیریں ان کے ذہنوں کو مفلوج کرتی ہیں۔ ان کو وقتی چاہتوں کے جھوٹے خواب دکھا کر اس

بات پر قائل کرتی ہیں کہ ہاں ! یہ غلط نہیں ہے - یہ تو تیری نجات ہے ، جب کہ وہ تو تیری جہنم تھی۔ یہ تو یوں ہوا کہ تو نے ایک جہنم کو چھوڑ کر دوسری جہنم چن لی۔اے ابن حوا !! یہ تو نے کیا کرلیا ؟ جھوٹ ، فریب کو چن لیا ؟

☆~~~~~~~~~~☆

اذلان مصطفی کراچی تقریبا 4 بجے پہنچا تھا۔ گھر جانے کی بجائے وہ ڈرائیور کے ساتھ ہسپتال ہی آگیا تھا۔ اس کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ خوف کے مارے دل سینے سے نکلنے کو تیار تھا۔ سامنے ہی اسے آئی سی یو کے باہر ارسل بیٹھا نظر آگیا تھا۔ مصطفی وہاں نہیں تھے ، اسے یہی توقع تھی۔

"ارسل۔۔کیسی ہے مام۔۔؟ " وہ اس کے پاس بیٹھتے بولا۔ ارسل نے گردن موڑ اسے دیکھا اور اس کے گلے لگ گیا۔

وہ ٹھیک نہیں ہے۔۔ڈاکٹر نے کہا ان کی جان کو خطرہ ہے۔" ارسل کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ خود بھی پریشان تھا ، آخر کون سی اولاد اپنی ماں کا دکھ دیکھ سکتی ہے ؟

" فکر مت کرو۔۔وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔۔" اذلان نے اسے چپ کروانا چاہا۔ وہ بڑا بھائی تھا ، اس کا فرض تھا خود مضبوط رہنا۔

" بھائی ۔۔آپ گھر سے مام کا کچھ سامان کے آئے۔ ہادی بھی یہاں آرہا ہے۔ تب تک ہم ہیں پاس۔" ارسل نے اذلان سے کہا تو اس نے اثبات میں سر کو خم دیا۔ اسے ویسے بھی بابا کو یہاں لانا تھا۔ ان کو یہاں ہونا چاہیے تھا۔

ارسل کو چپ کروا کر کچھ دیر ڈاکٹر سے تفصیلات پوچھتا رہا۔ ارسل نے اذلان کو گھر جا کر کچھ چیزیں لانے کو کہا تھا تو وہ بغیر کسی دوسرے سوال کے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا، سو " ایم اے " ویلا کی جانب بڑھ گیا۔ ایم اے ویلا کو تعمیر کرواتے ہوئے اس کا نام اپنے اور اذلان کے نام پر رکھا تھا۔ وہ ان کے نام کے پہلے حروف تھے۔ اذلان نے ڈرائیور کو ہسپتال رہنا کا ہی کہا تھا ۔ خود وہ ارسل کی گاڑی پر گھر آیا تھا۔ دور سے ہی وہ ویلا اپنی پوری شان و شکوت سے کھڑا نظر آیا۔ سفید ویلا۔۔جتنا وہ ویلا سفید تھا، اتنے ہی اس کے اندر رہنے والے مکینوں کے دل سیاہ تھے۔ اذلان کی نظر اس جانب اٹھی وہ کئی مہینوں بعد یہاں واپس آیا تھا۔ اس گھر کے مکینوں سے اس کا رابطہ بس فون کی حد تک ہی تھا۔ گیراج میں گاڑی کھڑی کرتے اس کے ہاتھ کامپ گئے۔ وہ ویلا۔۔اس ویلا سے اس کی کئی تلخ یادیں جڑی تھیں۔ وہ بچپن کی تنہا یادیں ، وہ کالی سیاہ راتیں۔ اس نے ان یادوں کو جھٹکا ۔ گاڑی سے باہر نکلا اور مین ڈور کھول کر اندر داخل ہوا۔

وہاں ملازموں کے سوا اسے کوئی نظر نہ آیا۔ بشیر دین نے اذلان مصطفی کو دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ایک بوڑھے ملازم تھے جو باہر لان کا خیال رکھتے تھے۔

" اذلان بابا۔۔کیسے ہیں آپ ؟ " وہ اپنی بوڑھی آواز میں کہتے اس کے قریب آئے اور اس کے سر پر پیار دیا۔ یہاں کے اکثر ملازم اذلان سے بہت خوش دلی سے ملا کرتے تھے۔

" ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟ اچھا وہ بابا کہاں ہیں۔" وہ سے پیار لے کر سیدھا کھڑا ہوا۔

" جی جی سب ٹھیک۔۔آپ کے بابا اپنے کمرے میں تھے۔ " اذلان نے سر کو خم دیا اور اوپر کی جانب بڑھ گیا۔ مصطفی کا کمرا اوپر کی جانب تھا۔

ان کے کمرے کے قریب رک کر اس نے گہرا سانس لیا۔ دروازہ ہلکا سا کھلا ہوا تھا۔ شاید ان کے ساتھ اندر کوئی موجود تھا۔ کوئی عورت۔۔مگر کون؟

" میں نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ کی بیوی پاگل ہے۔ کرلی نہ خودکشی اب۔۔" وہ عورت کافی تلخ لہجے میں کہہ رہی تھی ۔

" چلو اب تو چلی گئی وہ ہماری زندگی سے۔ " وہ سنہرے بالوں والی عورت تھی۔ اس کا رخ کھڑکی کی جانب تھا۔ جب کہ مصطفی پاس صوفے پر بیٹھے اپنے سیگار کے کش لگا رہے تھے۔

اذلان کے لیے مزید سننے ناقابل برداشت ہوا تو وہ مڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے اپنے باپ سے گھن محسوس ہوئی۔ جب وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ایک پل کو سہم گیا۔ سامنے اس کا بستر آج بھی ویسا ہی تھا جیسا اس وقت تھا جب چار ماہ پہلے وہ یہاں ایک رات رکا تھا۔ کیا کسی کو اس کی یاد نہیں آئی تھی ؟ کیا کسی نے بھی اس کے کمرے میں آکر اسے یاد نہیں کیا تھا؟ وہ اپنے بیڈ کی جانب بڑھا اور وہاں بیٹھ گیا۔ اس کا کمرا بلیک تھیم پر تھا۔ وہ اس کا پسندیدہ رنگ تھا یا شاید نفرت طلب۔
سیاہ۔۔اس لیے نہیں کہ وہ رنگ خوبصورت تھا اس لیے کہ یہ رنگ اس گھر کے مکینوں کے دلوں کی یاد دلاتا تھا۔ یہ رنگ اذلان مصطفی کو بتاتا تھا کہ اسے ان مکینوں سے جھوٹی امیدیں نہیں لگانی تھیں۔ یہ لوگ اپنے تھے ، پھر بھی اپنے کیوں نہیں لگتے تھے؟

اس نے رخ کمرے کے دوسری جانب موڑا تو کمرے کا وہ کونا واضح ہوا جہاں بلب کی روشنی کم جایا کرتی تھی۔ اس ایک کونے سے بھی اس کی کئی یادیں جڑی تھیں ۔ تلخ

یادیں۔ جنھیں نہ ہی یاد کیا جائے تو بہتر تھا۔ مگر وہ یادیں پھر بھی ذہن کی سکرین پر رنگ بھرنے لگیں۔

وہ ڈرا سہما بچہ ، جو اس کونے میں فرش پر بیٹھا تھا ۔ کانوں پر زور سے ہاتھ رکھے تھے تاکہ باہر کی آواز اس کے کانوں تک نہ جائے۔ وہ رو بھی رہا تھا۔ شاید وہ ڈر گیا تھا۔ اس کے اندر خوف کی زنجیروں نے اپنے بیڑا ڈال رکھا تھا۔ اسے ہر شے سے خوف محسوس ہوتا تھا۔

ذرا سی اونچی آواز۔۔

دروازے کا زور سے بند ہونا۔۔

تھپڑ۔۔ہاں تھپڑ کی آواز بھی۔۔

باہر سے آتیں آوازیں اونچی ہوئیں تو بچے نے ہمت کرتے اپنے کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھولا اور باہر دیکھا۔ اس کی مام اور اس کے بابا کافی اونچی آواز میں لڑ رہے تھے۔ وجہ شاید وہ تھا۔ ہاں۔۔ موضوع گفتگو اذلان مصطفی تھا۔ اذلان کا کمرا اوپری منزل مصطفی کے کمرے کے بلکل سامنے تھا۔ ان کے بیچ میں نیچے کی جانب سیڑھیاں تھیں۔

میں ہر وقت اس کی نینی بن کر تو نہیں رہ سکتی نہ!؟ وہ تمہارا بھی بیٹا ہے مصطفی۔ میں پارٹی پر جا رہی ہوں۔ جو کرنا ہے کرلو تم۔ خود نہیں سنبھال سکتے تو اس نینی سے کہو اس کے ساتھ رہ لیا کرے۔ مگر۔ میں۔ نہیں۔ رہو۔ گی! میں اس لڑکے کو اپنے پیروں کی زنجیر نہیں بنا سکتی! سنا تم نے!!! " وہ اتنی زور سے چیخ رہیں تھیں۔ مقابل شخص بھی کم نہیں تھا۔

" شٹ اپ!! تم سے شادی کیا کرلی تم تو اپنی اوقات ہی بھول گئ۔ اگر میں مصطفی ابراہیم نہ آتا تمہاری زندگی میں تو کیا تھی تم؟؟ سڑتی اپنی اس جہنم نما زندگی میں۔" وہ دھاڑے۔ اس چھوٹے بچے نے دیکھا اب اس کی مام غصے سے کچھ اور کہتیں کمرے کا دروازہ ٹھا مارتیں وہاں سے جا رہی تھیں۔ شاید انہیں پارٹی کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے اپنے بابا کو بھی کہیں جاتے دیکھا۔ شاید ان کی بھی کوئی گیٹ ٹو گیدر تھی۔ وہ بچہ واپس کمرے میں اپنی نم آنکھیں لیے آیا۔ اسی کونے میں پھر سے بیٹھ گیا۔اپنے اوپر ایک عورت کی چادر لے لی۔ یہ چادر اس کی مام کی تھی جو اس نے ان کی الماری سے چرائی تھی۔ شاید وہ یہ محسوس کرنا چاہتا تھا کہ اس کی ماں اس کے پاس تھی۔ بے حد قریب ، اسے محبت دیتی ہوئی۔ آہ ! ظالم دنیا ---دنیا ؟؟ ظالم تو اپنے تھے۔

"آہ ! زندگی میں ہر شے ہو بس اپنے ظالم نہ ہوں۔"

وہ کسی ٹرانس کی کیفیت سے جاگا۔ نظریں اس کونے سے پھیر لیں۔ یوں ہی دل میں خیال امڈ کر آیا۔ کہ جب وہ شادی کرے گا تو اپنے گھر کو ویسا بنائے گا جیسا اس نے تصور کیا تھا۔ ہر زنجیر سے پاک۔۔صرف محبتوں کا محور۔۔جہاں اس کی ایک خوبصورت فیملی ہوگی۔ وہ اپنے بچوں کے ایک خوبصورت زندگی دے گا۔ انہیں وہ پیار دے گا جس پیار کو وہ ترستا تھا۔

مگر کیا یہ سچ نہیں کہ۔۔

" فقط نہ مکمل خوابوں کا جھانسا ہے زندگی۔"

رات سب کی ایک ہوتی ہے ، اندھیرے اپنے اپنے ہوتے ہیں۔

☆~~~~~~~~~☆

ایک عورت اس وقت کیچن میں ملازموں کے اوپر آڈر جھاڑنے میں مصروف تھی۔ اس عورت کے بال سنہرے تھے۔ شاید وہ بالوں کو ڈئے کرتی تھی۔

" ہائے آنی ! کیا بنوا رہیں ہے ناشتے میں؟ " میر ہادی نے ان کو پیچھے سے گلے لگاتے کہا۔ میر ہادی؟؟ اووو یہ تو آنی تھیں مگر پھر وہ اذلان کے گھر کیا کر رہیں تھیں ، وہ بھی۔۔ مصطفی کے کمرے میں؟

" تمہارے فیورٹ پین کیکس۔" وہ بولی تو لہجے میں شیرنی گھل گئی۔

" میں تو آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ ہاسپٹل جا رہا ہوں۔ مصطفی صاحب کی بیوی نے آج خودکشی کی کوشش کی تھی ۔ " وہ ان کو آگاہ کر رہا تھا ، وہ جو پہلے ہی آگاہ تھیں۔

" ریئلی؟؟؟ یہ تو بہت افسوس ناک بات ہے ہادی۔" انھوں شاکی نگاہوں سے ہادی کو گھورتے کہا۔ کیا کمال اداکاری تھی نہ؟؟

" جی آنی۔ بابا کو تو پتا ہے آپ کو نہیں بتایا انھوں نے؟ " ہادی نے ان کا گال چومتے کہا۔

" نہیں۔۔آج کل۔۔ذرا کم بنتی ہے ہماری۔" انھوں نے پہلو بدلہ۔

" اووو کیوں ؟ " وہ سوالیہ نظروں سے ان کو دیکھتے ٹیبل پر بیٹھا۔ وہ جو اسے وجہ بتا دیتی تو شاید وہ انھیں مار ہی ڈالتا۔

" کچھ نہیں ہادی۔۔میاں بیوی کے میٹرز یو نو۔" انہوں نے بات بدلی ہادی کو ناشتہ سرو کروایا۔

" ڈیڈ کچھ زیادہ ہی آج کل مصروف ہیں نہ؟ آپ کے ساتھ اس ہفتے ڈنر پر بھی نہیں گئے۔" وہ اب کھانا کھا رہا تھا۔

ہر بات سے بے خبر۔وہ میر ہادی تھا ، ظلم ، سفاک سب تھا۔ کوئی اس سے غداری کرتا اور بچ جاتا یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ مگر وہ تو لوگ تھے۔ غیر تھے۔۔ وہ یہ کیوں بھول گیا تھا کہ غداری کی سب سے پہلی زنجیر تو اپنے ہی آستین میں پلتے سانپوں سے ہوا کرتی ہے۔ اپنوں سے۔۔اور اپنوں کے زخم جو ایک بار لگ جائیں تو جلدی بھرا نہیں کرتے۔

☆~~~~~~~~~☆

یہ ہاسپٹل کا منظر تھا۔ اذلان اپنی مام کے کچھ کپڑے لے کر آیا تھا۔ اس نے سٹول پر ارسل کے ساتھ ہادی کو بیٹھے بھی دیکھا تھا۔ اسے ہادی اچھا نہیں لگتا تھا مگر یہ وہ وقت نہیں تھا جب اپنی ناپسندیگی کا اظہار کیا جاتا۔ اذلان نے ارسل کو وہ سامان دیا اور خود ہادی کے ساتھ والے سٹول پر بیٹھ گیا۔ یہ ہاسپٹل کا وی آئی پی ائیرا تھا۔ اس لیے وہاں لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ ارسل ڈاکٹر کو وہ سامان دینے کے لیے وہاں سے چلا گیا۔

" دکھ ہوا اذلان تمہاری ماں کا سن کر بچاری کا خودکشی کرنا بنتا بھی تھا ویسے تمہارا باپ ہی ایسا ہے۔" ہادی نے سگریٹ دانتوں میں دباتے کہا۔ اذلان نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لی۔

" سنا ہے تمہاری ماں کا چکر تھا شاید کسی سے اس لیے تو نہیں کی خودکشی؟ یا شاید سکینڈل ہی ہو گا یہ تو۔" اس سے پہلے ہادی کچھ اور کہتا اذلان نے اس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کیا۔

" تمہاری اتنی ہمت کہ تم میر ہادی پر ہاتھ اٹھاؤں؟؟ " ہادی نے اذلان کو مارنا چاہا مگر ارسل ان کے بیچ میں آگیا۔

"آئندہ میری مام کے بارے میں کوئی ایسی بات کی تو یاد رکھنا چھوڑو گا نہیں تمہیں! " اذلان غصے سے چیخا۔

" چھوڑوں گا تو اب میں بھی تمہیں نہیں مسٹر اذلان۔ " ہادی نے اس کی جانب بڑھنا چاہا مگر پیچھے سے میر گیلانی اور مصطفی ابراہیم آتے دیکھائی دیے تو خاموش ہوگیا۔

یہ اگلے دن رات کی بات تھی۔ ارسل اور مصطفی گھر گئے تھے۔ ہاسپٹل میں صرف اذلان تھا۔ وہ بار بار آئی سی یو کے پاس جاتا اور پھر واپس مڑ جاتا۔ وہ انہیں قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر ہمت کہاں سے لاتا؟ چند منٹوں بعد کافی ہمت جمع کر کے وہ اندر

داخل ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی ہاتھ کی نس کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ خون کے ضائع ہونے کی وجہ سے انہیں کافی ڈرپس بھی لگائی گئی تھیں۔ ایک نرس ان کی ڈرپ میں ٹیکے سے کوئی دوائی بھر رہی تھی۔ وہ ان کے پاس سٹول کرکے بیٹھا۔اسے علم تک نہ ہوا کہ پاس کھڑی وہ نرس اس سے اس کی ماں کی زندگی چھیننے آئی تھی۔ اس سے ظالم شے اور کیا ہوتی؟ کہ ایک بیٹے کے سامنے اس کی ماں کی زندگی چھین لی گئی تھی۔ نرس نے اپنے چہرے پر آیا پسینا صاف کیا اور وہاں سے چلی گئی۔ اذلان کو کسی شے کا علم تک نہ ہو سکا۔ اگر وہ اس وقت جذبات سے لبریز نہ ہوتا تو یقینا جان جاتا کہ وہ دوائی نہیں تھی ۔ وہ پویزن تھا۔ ان کا ہاتھ نرمی سے تھاما اتنی نرمی سے کہ گویا خوف ہو کہ ان کو درد نہ ہو۔ آنکھوں سے کب آنسو بہنے لگے اسے علم تک نہ ہوا۔

" مام--پلیز واپس آجائیں --آپ میرے لیے میری جنت ہیں۔ میں اپنی جنت کھونا نہیں چاہتا۔" اس نے ہولے سے سر ان کے ہاتھ کے پاس بیڈ پر ٹکا دیا۔

وہ کتنی دیر روتا رہا اسے علم تک نہ ہوا۔ چند لمحوں بعد اس نے کسی کی انگلیوں کا لمس اپنے بالوں پر محسوس کیا تو وہ شل رہ گیا۔ بے یقینی سے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ ہلکی کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہیں تھیں۔ وہ ہولے سے مسکرائی تو اذلان مصطفی کولگا دنیا کی

سب سے قیمتی شے ان کی وہ مسکراہٹ ہی تھی۔ پھر کب ان کی مسکراہٹ سمٹی اسے علم نہ ہوا۔ وہ گہری وادیوں گم ہو گئیں۔ اذلان نے ان کا تھام رکھا تھا وہ خود بھی ایک ڈاکٹر بن رہا تھا۔ کب نبض نہیں چلتی یہ تع جانتا ہی تھا۔ وہاں زندگی کا کوئی اثار نہیں تھا۔ اذلان مصطفی سے اس کی جنت لے لی گئی تھی۔ وہ خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا اس وقت دنیا کا سب سے بڑا خسارا کیا تھا ؟ تو وہ کہتا اپنی جنت کو کھونا۔ اس نے نرس کو چیخ کر بلایا۔ چند منٹوں میں ہی ڈاکٹر اور نرس وہاں موجود تھیں ۔ لیکن یہ وہ نرس نہیں تھی۔

" یہ مر چکی ہیں۔" ڈاکٹر نے اذلان کی جانب دیکھتے کہا اس کیا مام کے چہرے پر سفید کپڑا ڈال دیا گیا۔ ساری زندگی کے خوف پل بھر میں ٹوٹے تھے۔ اسے اب کبھی کسی شے سے خوف نہیں آسکتا تھا۔ اب بھلا کیسا خوف؟ ہر شے تو لٹ گئی تھی۔

ہسپتال کے باہر کھڑی وہ نرس اب فون پر کسی کو آگاہ کر رہی تھی۔

" کام ہو گیا ہے میڈم جی۔ " اس نرس نے فون پر موجود دوسری جانب بیٹھی ایک عورت سے کہا۔

''گڈ۔ پیسے تمہارے اکاونٹ میں بھیج دیے ہیں۔ رات کے اندر دفعہ ہو جاو کسی دوسرے شہر۔'' حکمیہ لہجے میں کہا گیا۔

'' اوکے میڈم جی۔'' فون کاٹ دیا گیا۔

'' ہوا کام ؟ '' علیشان کمرے میں بیٹھے ایک شخص نے اپنے سامنے کھڑی اس سنہرے بالوں والی عورت سے پوچھا۔

'' ہاں ہو گیا بیٹا۔'' اس عورت کے چہرے پر اب مسکراہٹ تھی۔

'' مجھے اپنی ماں کے لیے مارا تھا نہ تو نے۔ لے اذلان مصطفی میں نے تیری ماں کو ہی مار دیا۔'' میر ہادی چہرے پر مسکراہٹ سجائے خود سے بولا۔

'' تھینکس آنی۔ '' اس نے اب سامنے کھڑی عورت سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

'' تھینکس بیٹا ۔ میرے راستے کی ایک اور رکاوٹ ختم کرنے کے لیے۔'' سنہرے بالوں والی عورت کی آنکھوں میں بے پناہ زہر تھا۔ سانپ جیسا زہریلی زہر۔ جو ایک بار ڈس لے تو زندہ نہیں رہنے دیتا۔

☆~~~~~~~~~☆

زمین پر ایک شخص بے سدھ پڑا تھا۔ وہ ایک کمرے کی مانند تنگ جگہ تھی۔ جس کی دیواروں پر خون کے نشان تھے۔ یہ بیسمینٹ کا منظر تھا۔ وہ شخص بری طرح سے زخمی تھا، خون کی لمبی لائن اس کے سر سے پھسلتی ہوئی نیچے گردن تک جارہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اسے اپنے سینے میں بہت شدت سے درد ٹیس اُٹھتی محسوس ہوئی۔ جب اس نے اپنے سینے پر ہاتھ لگایا تو اسے ایک پتھر نما شے سینے میں اترتی محسوس ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اوپر کی جانب دیکھا تو وہ ساکت ہوا۔ اس کے سامنے میر ہادی کھڑا تھا۔ جو اس کے سینے میں خنجر کھبو رہا تھا۔ وہ شخص پچھلے کئی دنوں سے اس بیسمینٹ میں بند تھا۔ مگر اس نے ہمت آزادی کی امید پر نہیں ہاری تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ جو ایک بار یہاں آ جاتا تھا وہ واپس زندہ تو ہر گز نہیں جاتا تھا۔ یہ میر ہادی کا اصول تھا۔

" بہت درد ہو رہا نہ اے ایس پی احمد ؟ " میر ہادی کی روب دار آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ یہ آواز پہنچاتا تھا۔ وہ اس شخص کو پہنچاتا تھا، اسے کیسے بھول سکتا تھا اے ایس پی احمد؟ اسی کے خلاف تو وہ آواز اٹھا رہا تھا۔ شاید وہ اس شخص کی حقیقت سامنے لانے کے لیے کئی مہینوں سے کام کر رہا تھا۔

" تمہیں کہا بھی تھا اے ایس پی میرے کاموں میں داخل اندازی مت دو۔ مگر تم نے نہیں سنی نہ؟ ویسے ایک گڈ نیوز دو تمہیں؟ تمہاری بیوی کو جس دن میں نے کنٹینر میں لوڈ کروایا تھا اس نے اسی دن خودکشی کرلی تھی۔ " وہ میسنی ہنسی ہنسا۔ اے ایس پی احمد کو اپنا سانس رکتا محسوس ہوا۔

" خیر ہے۔۔رو لو اس کے لیے۔ تمہاری وفادار ہوتی تو جنید کی باتوں میں آکر پیسوں کے لیے اس سے دوستی تھوڑی کرتی؟ آہ افسوس ہوتا تمہاری قسمت پر۔ آرام سے میری راستے سے ہٹ جاتے تو یہ نہ کرتا میں۔" ہادی نے اسے بالوں سے کھینچ کر زمین پر گرایا۔ میر ہادی اس شخص کا مذاق بنا رہا تھا جس نے اپنے ملک سے وفاداری نبھائی تھی۔ آہ ! مگر وہ شخص تو اپنے پیاروں کے ہاتھوں ہار گیا تھا۔ غیروں سے کیا شکوہ کرتا ؟

" زخم تو ہمیشہ اپنوں کے گہرے لگتے ہیں، ایک خنجر کی ماند سینے میں اترتے ہیں۔"

" میں نے اپنا فیصلہ اپنے رب چھوڑ دیا ہے میر ہادی!! تم نے میری محبت مجھ سے چھینی ہے نہ اللہ تم سے تمہاری محبت چھین لے گا!!! تم نے معصوموں کی جانیں لی ہے نہ؟؟ میرا اللہ تمہاری جان بھی لے گا !!! " اے سی پی احمد روتے روتے زور سے چیخا تھا۔

ہادی نے کونے میں پڑی لوہے کی زنجیر اٹھائی اور پوری قوت سے اسے مارنے لگا۔ بے حسی کی انتہا تھی ۔ احمد درد سے تڑپ رہا تھا، مگر اس نے زندگی کی بھیک نہیں مانگی۔ وہ اس زندگی کی بھیک میر ہادی سے کیوں مانگتا جو اسے اللہ نے عطا کی تھی۔ وہ شخص جو اپنے ملک کا وفادار تھا ہار گیا تھا۔ مگر اصل میں تو وہی جیتا تھا۔ تڑپتے ہوئے اس کے ہونٹ کچھ پڑھ رہے تھے۔ وہ کلمہ شہادت تھا۔ وہ شخص شہید تھا۔ وہ ہارا کب تھا ؟ وہ جیت کر امر ہوگیا تھا۔ وہ اپنے رب کی عدالت میں جیت گیا تھا۔ وہ اب تڑپ نہیں رہا تھا اس کا وجود ساکت تھا۔ وہ مر چکا تھا۔

'' امین !!! اس کے بھی آرگنز نکال کر لوڈ کروا دینا۔'' ہادی نے باہر کھڑے ڈاکٹر کو آواز دی ۔ وہ بھاگا بھاگا اند آیا اور سر کو خم دے دیا۔

میر ہادی آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیسمینٹ سے باہر آیا۔ وہ ایک جنگل نما جگہ تھی۔ شاید کوئی نیچرل پارک ؟ نہیں---یہ تو-- کراچی کلیفٹن پارک کا دایاں حصہ تھا۔ بائیں جانب والی جگہ لوگوں کے لیے پارک کی طرح کھلی تھی۔ جب کہ آگے کا داخلہ حکومت نے بند رکھا تھا۔ حکومت میں تھا کون؟ میر گیلانی؟ بیسمینٹ کے اس جانب گھنے درختوں کے بیچ بنائی گئی تھی۔ اس جگہ درخت بہت زیادہ تھے۔ بیسمینٹ کا دروازہ باہر سے زمین کا ہی

ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ باہر کئی گاڈز پہرا دے رہے تھے۔ یہاں اور کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایسے خوبصورت مقام پر ایسے دل دہلا دینے والے کام بھی کیے جاسکتے تھے۔ بیسمینٹ کے اگلی جانب ایک سنسان سڑک تھی جو سیدھا کراچی پورٹ کی طرف کھلتی تھی۔ ان کے لیے ٹرکوں کو لوڈ کر وہیں سے بندرگاہ بھیج دینا بہت آسان تھا۔ وہاں سے اس سامان کو کنٹینرز میں لوڈ کروا دیا جاتا تھا۔

میر ہادی اب سڑک کی جانب جارہا تھا جہاں اس کی کار پارکڈ تھی۔ وہ ایک درندہ تھا۔ لوگوں کو تڑپتا دیکھ کر اس کو سکون ملتا تھا۔ وہ کوئی ایسا ویلن نہیں تھا جسے دکھوں نے ایسا بنا دیا ہو۔ یہ سب اس کی چوائس تھی۔ اس نے یہ راستہ اپنے شوق سے چنا تھا۔ وہ اتنا بھی بچہ نہیں تھا کہ میر گیلانی نے اسے اس طرف لگایا اور وہ لگ گیا۔ یہ اس کا اپنے اعمال تھے۔ مگر وہ کیوں بھول گیا تھا کہ اعمال کا حساب دینا پڑتا ہے۔ وہ گاڑی کے اندر بیٹھا تو آنکھوں کے آگے وہ نیلی آنکھیں پھر سے لہرائیں۔ افففف۔۔ اس نے جس دن سے اس لڑکی کو دیکھا تھا وہ اسے ہی سوچ رہا تھا۔ وہ عائشہ صدیقی تھی جس کے نام کو اس نے چند دن پہلے ہی جانا تھا۔ اس کا بائیو ڈیٹا اس کی کار میں ہی پڑا تھا۔ وہ اس فائل کو پھر سے پڑھ رہا تھا۔ وہ اسے پچھلے چند دن سے بار بار پڑھ رہا تھا۔

جلد وہ اسے ملے گا اس نے دل میں سوچا۔ وہ بھول گیا تھا ، وہ ظالم تھا اور ظالم لوگ محبت کرنے کی غلطی نہیں کیا کرتے۔

آنکھیں جھوٹ ، نظارہ جھوٹ

یعنی جو ہے ، وہ سارا جھوٹ

ہم کو آج ، کہو پھر اپنا

بولو آج ، دوبارہ جھوٹ

☆~~~~~~~~~~☆

ہادی رات کو تھکا ہوا گھر آیا تھا۔ وہ ارسل کی ماں کے جنازے سے ہو کر آیا تھا۔ اذلان کو تکلیف میں دیکھ کر اسے کیا خوشی ملی تھی یہ کوئی میر ہادی سے پوچھتا۔ وہ اپنے کمرے میں جانے والا تھا جب اس کی نگاہ میر گیلانی کے کمرے کی جانب اٹھی۔ کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میر گیلانی اور آنی کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ جب ہادی نے غور سے سنا تو وہ پل بھر میں مٹی کا ڈھیر ہوا۔ ساکت۔۔ شل۔۔

'' مجھ سے فضول بحث نہ کرو تبسم ۔ اگر میں نے ہادی کو بتا دیا نہ کہ گل کھلا چکی ہو تم وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑا گے۔'' میر گیلانی غصے سے چیخے تھے۔

'' جرت بھی نہ کرنا۔۔جو بھی کیا میں نے آپ کو پانے کے لیے کیا گیلانی۔۔'' وہ بھوکی شیرنی کی طرح چیخی تھیں۔ یوں جیسے انہیں معلوم ہو اگر ہادی کو پتا چلا کیا خوفناک سزا دے گا۔

'' مجھے پانے کے لیے۔۔۔؟؟؟ '' وہ استہزایہ ہنسے۔

'' یہ کہو کہ میرے پیسے پانے کے لیے۔ اگر اس دن میں تمہاری اس دوست سے فون کال نہ سنتا مجھے تو کبھی علم ہی نہ ہوتا کہ تم ہادی کی ایک اتنی بڑی خوشی کی قاتل ہو۔'' وہ غصے سے بولے۔

'' صرف میں تو گناہگار نہیں تھی ۔ آپ نے بھی تو اس وقت اس کی ماں کو دھوکہ دیا تھا نہ میرے ساتھ ؟؟ جب وہ پریگنینٹ تھی۔ میں نے تو صرف ہادی کی ماں کو قتل کروایا تھا۔ اس کی ڈرپ میں زہریلا معادہ ڈلوایا تھا۔ مگر آپ نے کیا کیا میر گیلانی؟؟؟ آپ نے تو اپنی محبت سے بے وفائی کی تھی۔ اس محبت سے بے وفائی جس کو پانے کے لیے دن رات ایک کیے تھے۔ '' سنہرے بالوں والی تبسم علی انہیں ان کی حقیقت بتا رہی تھی۔

" اوقات میں رہے اپنی تبسم۔ اگر میں تمہیں نہ اپناتا تو فقط ایک ملازمہ تھی۔ اور رہی بات میری بیوی سے بے وفائی کی۔۔تو تم نے بڑا ظلم کیا ہے اس کے ساتھ اس کو مار کر۔ بے وفائی کا کیا۔ ہر مرد کرتا ہے ۔" وہ پیشانی پہ آیا پسینا صاف کیا جو آئے سی کے باوجود آگیا تھا۔

" یہ نہ بھولو گیلانی۔۔۔قتل سے بڑا جرم بے وفائی کا جرم ہوتا ہے۔" وہ بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئیں۔

کمرے کا دروازہ ہلا تو دونوں نے بیک وقت اس جانب دیکھا۔ میر ہادی دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ دونوں کی رنگت بیک وقت سفید پڑی۔۔لٹھے کی ماند سفید۔۔۔یوں جیسے سامنے کھڑا شخص روح قبض کرنے کی طاقت رکھتا ہو ، اور وہ رکھتا بھی تھا۔ وہ کن وحشت ناک آنکھوں سے ان کو دیکھے گیا یہ بیان کرنا مشکل تھا۔ سیاہ آنکھیں جن کی رگیں لال اور واضح تھیں۔ غصہ ،تپش ، نفرت ، محبت۔۔؟؟؟ نہیں محبت نہیں۔ ان آنکھوں میں سب تھا بس سامنے کھڑے ان دو لوگوں کے کیے محبت نہیں تھی۔ کتنی ہی راتیں اس نے اپنی ماں کی تصویر دیکھتے گزاری تھیں۔ ان کو یاد کرتے ، ان کے دکھ میں میر ہادی نے کتنی راتیں بے سکونی سے گزاری تھیں۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ وہ آج جو بھی تھا خود کی وجہ سے

تھا۔ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ اس کے باپ نے پیسے کی حوس میں بچپن سے ہی اسی طرح تربیت دلوائی تھی۔ اسے ایسے تراشا تھا، ایسے پرورش دی تھی کہ وہ ان کے لیے وہ سب کرتا جو وہ چاہتے تھے۔ وہ تو خود زنجیر میں لپٹا ایک انسان تھا۔ وہ ایک ایسا قیدی تھا جسے قید کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ یہ تو فقط ایک دلاسا ہی تھا کہ یہ سب اس نے خود نے چنا تھا۔
اس کی کمزور بے سکون راتوں کی ساتھی تو اس کی ماں کی وہ تصویر ہی تھی جسے وہ سینے سے لگا کر اکثر سویا کرتا تھا۔

وہ جانتا تھا اگر آج اس کی ماں زندہ ہوتی تو وہ ایسا درندہ کبھی نہ بنتا، جیسا اسے بنا دیا گیا تھا۔ وہ تو ایک ایسا لڑکا ہوتا جس کا مکان نہ ہوتا، جس ایک گھر ہوتا۔ ویسا گھر جیسا عام لوگوں کا ہوتا تھا۔ وہ عام لوگ جو اس شان و شوکت دیکھ کر اس پر رشک کرتے تھے۔ وہ کا جانتے تھے ؟ کہ وہ بھی ویسی رشک بھری نگاہ سے ان کو دیکھا کرتا تھا۔ یہ دولت اس کے کس کام کی تھی؟ جب اس کے پاس مکان ہی مکان تھے۔ گھر تو تھا ہی نہیں۔
اسے آج سمجھ آئی تھی۔۔

" ہر اپنا، اپنا نہیں ہوتا۔"

جن دو لوگوں نے اس کے سامنے یہ اطراف کیا تھا ۔ وہ ان پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتا تھا۔ وہ تو اپنے تھے نہ ؟ پھر دغا باز کیسے نکل آئے تھے ؟ اس نے زخمی نگاہوں سے اس جانب دیکھا۔ ہاں وہ زخمی نگاہیں تھیں، اس انسان کو حیوان تو انہی دونوں نے بنایا تھا نہ۔ اس کی آنی نے ہی تو اسے ایسا سفاک بننا سکایا تھا۔ اس کے بابا نے ہی تو اسے ظلم کرنا سکھایا تھا۔ وہ دو لوگ تو اس کی ماں کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے وجود کے بھی قاتل تھے ۔ تو کیا وہ انہیں بخش دیتا ؟ وہ بخشتا تو اب جب وہ انسان ہوتا ۔ انہوں نے ہی تو اسے حیوان بنایا تھا ۔ وہ کیسے انہیں بخش دیتا۔

" تم اکیلے رہ جانے کے خوف سے بے قدروں سے نہ بندھے رہنا۔" اس نے ہلکی سے سرگوشی کی۔ ان دونوں کے رنگ مزید سفید پڑے۔

" رحمان !! ملازموں کو آج رات چھٹی دے دو۔ کچھ حساب ، کچھ اپنوں سے باقی تھے ، آج پورے کرنے کا وقت ہے۔" اس نے شیر کی سی ڈھار سے کہا۔ رحمان جو میر ہادی کا پرسنل باڈی گارڈ تھا اس نے فورا سر کو خم دیا اور کمرے کا دروازہ اس کے پیچھے سے بند کر کے چلا گیا۔

" ہادی۔۔میری۔۔بات سنو۔۔۔یہ عورت۔۔ہے قاتل۔۔میں نے تو بس۔۔۔ذرا۔۔۔سا افئیر۔۔" میر گیلانی نے کانپتی آواز میں کہا۔

" شٹ اپ ڈیڈ !!! ذرا سا افیئر نہیں تھا وہ۔۔" وہ اتنی زور سے چیخا کے اس محل نما گھر کی در و دیوار ہل کر رہ گئی۔

" ہادی۔۔افئیر تھا۔۔بس وہ۔۔۔اگر۔۔تم ہوتے تم تو بھی۔۔تو یہی کرتے۔۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولے تھے۔ وہ جانتے تھے میر ہادی کیا کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ انہوں نے ہی اسے ترشا تھا۔ اس کی ذات سب ڈالا تھا، سوائے رحم کے۔

"آپ کو لگتا ہے کوئی لڑکی میری محبت ہوتی ، میری بیوی ہوتی تو میں اس سے بے وفائی کرتا ؟ میں تو اس کی ایک آنکھ سے ایک انسو نہ نکلنے دیتا ڈیڈ۔ میں اس کو اپنے سر کا تاج بنا دیتا ۔ اس کے پیر چوم لیتا مگر اسے کبھی تکلیف دینے کا نہ سوچتا۔" وہ بولا چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھوں کے آگے وہ نیلی آنکھیں آئیں۔ ہاں وہی نیلی آنکھیں جو اسے اس کی ماں یاد دلاتی تھیں۔ اس نے صحر جھٹکا۔ یہ وقت نہیں تھا اسے سوچنے کا۔ وہ تو اس پاک لڑکی کو ایسے غلیظ لوگوں کے سامنے سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے تکلیف دینا تو بہت دور کی بات تھی۔

آج میر ہادی کو اندازہ ہوا تھا کہ مریض عشق بن گیا تھا۔ آج اس نے سوچا تھا، وہ کہے گی تو۔۔۔

" اس کی محبت پر آمین۔۔

اس کا غصہ سر آنکھوں پر۔۔

اس کی انا قبول۔۔

ہر ضد منظور۔۔

فقط محبت میں شامل۔۔

کوئی تیسرا نہ ہو۔۔"

اس نے اس لڑکی کے صحر کو پھر سے پرے جھٹکا۔۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے باپ اور اس دوغلی عورت کو دیکھا تو نفرت پھر سے رنگ بھرنے لگی۔ اس نے غصے سے اپنے باپ کو دیوار کے ساتھ لگایا۔ انہیں اتنا مارا کہ ان کے منھ سے خون نکلنے لگا۔ چہرے کی حالت بگڑنے لگی۔ تبسم علی کسی ٹرانس کی کیفیت میں یہ سارا منظر دیکھے گئیں۔ وہ دوغلی عورت تھی ، ایسے ہی تو کسی منظر سے بچنے کے لیے انہوں نے اذلان کے باپ کو

پھسایا تھا۔ وہ انہیں تحفظ دے گا۔ ہاں مصطفی ابراہیم انہیں تحفظ دے گا۔ وہ دروازے کی جانب لپکی تاکہ بھاگ سکے۔ نگر دروازہ باہر سے لاک تھا۔ وہ اپنی تربیت کو اتنا کم عقل کیسے سمجھ بیٹھیں؟ وہ میر ہادی تھا، وہ بازی کھیلنے سے پہلے شکار کا پنجرہ تیار کرتا تھا۔ تبسم علی واپس مڑی تو خوف سے ان کی ٹانگیں لرز اٹھیں۔ میر گیلانی خون و خون ہوکر زمین پر گرا پڑا تھا۔ جسم میں جنبش نہ ہونے کے برابر تھی۔ شاید وہ مر چکے تھے۔

"ہا۔۔۔ہادی۔۔۔میں نے تمہیں۔۔۔ماں بن کر۔۔۔پالا۔۔ہے۔۔۔مجھے۔۔۔معاف کر دو۔۔" وہ روتے اس کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔ وہ اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگیں۔ وہ کیسے بھول گئیں تھیں۔ انہوں نے تو اسے رحم کرنا سکھایا ہی نہیں تھا۔ ماضی کی وادیوں سے دور آج وہ وہی کاٹ رہیں تھیں جو انہوں نے بویا تھا۔ ہادی نے غصے سے ان کو کھڑا کیا اور ان کی گردن اپنے سخت ہاتھوں میں تھام کر ان کا گلا دبایا۔ وہ پیچھے کھسکتیں دیوار کے ساتھ جالگیں۔ زور زور سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے پیٹتے وہ سانس لینے کی کوشش کر رہیں تھیں۔ پھر چند لمحے گزرے تو وہ ساکت ہو گئیں۔ ہاتھوں کی حرکت دم توڑ گئی۔ ہادی نے ان کو چھوڑا تو ان کا بے جان وجود زمین پر جا گرا۔

اس نے رخ موڑا تو آئینے میں اس کا وجود نظر آنے لگا۔ اس کی سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ پر خون کے بے شمار دھبے اور چھینٹے تھی۔ چہرے پر ابھی تک اس کے باپ کا خون تازہ تھا۔ اس نے نفرت سے کمرے میں موجود ان دو لاشوں کو دیکھا۔ بس اتنی سی دیر لگتی ہے کسی انسان کے " لاش " کہلانے میں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دنیا سے اس کا پردہ ہو جاتا ہے۔

" رحمان!!! لاشیں ٹھکانے لگا دو۔ یوں لگنا چاہیے کہ کار ایکسیڈنٹ ہے۔ جس جس کو پیسے کھلانے پڑے کھلاو۔ اگلے چند دن میں میر ہادی کراچی کا صدر کہلایا جائے گا۔" وہ اپنی روب دار آواز میں بولا۔ رحمان نے جی سر کہہ کر اثبات میں سر ہلایا اور بندوبست کرنے لگا۔

اسے لگ رہا تھا انہیں مار کر اس نے خود ان کی قید سے آزاد کروا لیا تھا۔ وہ یہ کیوں بھول گیا تھا کہ وہ آزادی نہیں تھی جو اسے اب ملی تھی۔ وہ تو ایک نئ قید تھی۔ ایک ایسی قید جس کی زنجیر کی چابی تو اس کے ہاتھ میں تھی۔ مگر اسے علم نہ تھا کہ اسے کھولا جائے۔ اسے تو مکان کو گھر بنانا تھا۔ کیا خون سے گھر بنتے ہیں؟ کیا کر بیٹھا تھا وہ خود

کے ساتھ ؟ اپنی ماں جیسی آنی ، اپنی جنت کو اس نے اپنے ہی ہاتھوں سے مار ڈالا۔ پر جسے وہ جنت سمجھ رہا تھا وہ تو آگ برساتی دوزخ تھی۔

ہادی اپنے کمرے میں آیا ۔ بیڈ کے سائڈ والے دراز کو کھولا اس عورت کی تصویر باہر نکالی جو اس کی کل کائنات تھی۔ تصویر میں موجود وہ نیلی آنکھوں والی عورت اس کی ماں تھی۔ ان کی نیلی آنکھیں دیکھ کر اسے پھر سے عائشہ صدیقی یاد آئی۔ آج اس پر ایک محبت آشکار ہوئی تھی۔ اپنے دل کی محبت۔ عائشہ صدیقی۔ اس لڑکی نے میر ہادی کے دل میں اس ڈیرا جمایا تھا کہ اسے خود بھی علم نہ ہوا کہ کب وہ مرض قید سے مرض عشق بن گیا۔

پھر جن لوگوں کا بسرا دل میں ہو جائے وہ کہاں دل سے نکلتے ہیں ؟ ان کو دل سے نکالنے کے لیے تو دل نکالنا پڑتا ہے۔

پچھلے چند گھنٹوں کے مناظر میر ہادی کی آنکھوں کے آگے گردش کرنے لگے۔ اس نے نفرت سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کی روح کے قاتل تو اس کے آستین کے سانپ نکلے تھے۔ وہ سانپ جن کو وہ خود ہی ساری زندگی غذا فراہم کرتا رہا تھا۔ وہ یہ کیوں بھول گیا تھا کہ یوں ہی بدنام تھیں آستینیں، سانپ تو دل کے مکین ہوا کرتے تھے۔

☆~~~~~~~~~~☆

یہ جمعہ کا دن تھا۔ اذلان آج صبح ہی کراچی سے واپس اسلام آباد آیا تھا۔ جب سے اس کی مام کی دیتھ ہوئی تھی وہ کافی بے چین تھا ۔ اسے جس سکون کی تلاش تھی وہ اسے کراچی میں تو ہر گز نہیں مل سکتا تھا۔ خوف کی جو زنجیر اس نے بچپن سے اپنے سینے سے باندھ رکھی تھی وہ ٹوٹ گئی تھی۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ آنے والا مستقبل اس کے حصے میں کتنی زنجیریں لا رہا تھا۔ شاید وہ خوش نصیب تھا جو وہ اپنی ماں کی آخری رسومات میں شریک ہوا۔ یا شاید وہ بد نصیب تھا کہ اس کے سامنے ہی اس کی ماں کی موت کو یقینی بنایا گیا اور وہ دیکھ تک نہ سکا۔ نجانے آنے والا کل کیا کیا راز کھولنے والا تھا۔ کون سی زنجیر اس کے سینے سے باندھنے والا تھا۔ فریش ہو کر وہ یونیورسٹی کے کیے نکل آیا تھا۔ اگر ہاسٹل میں رہتا تو اسے چین نہ آتا۔ پروفیسر طارق سے اس سارے معاملے پر وہ کافی گائیڈینس لیتا رہا تھا۔ وہ جذبات میں آکر کوئی غلط نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ پروفیسر طارق اس کے لیے اس کے باپ کا مقام رکھتے تھے۔ جو دینی فرائض اس کا سگا باپ ادا نہیں کرسکا تھا وہ انھوں نے کر دیے تھے۔

وہ ہال میں داخل ہوا اور معمول کے مطابق سٹیج پر چڑھ گیا۔ سیاہ شلوار قمیض پر سفید شال لیے وہ اپنے مخصوص حلیے میں تھا۔ اس کی آنکھیں اداسی کی ایک داستان سنا رہی

تھیں۔ وہ جب بھی کوئی سپیچ دیتا تھا اس میں آیات کا حوالہ ضرور ہوتا تھا۔ اسے اچھا لگتا تھا آیات کا حوالہ دینا۔ یہ اس کی سپیچ کی سب سے خاص بات تھی۔ وہ کتنا خوبصورت بولتا تھا ۔ کاش کوئی اسے بتاتا۔

" اسلام و علیکم۔ آج میں۔۔صبر کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ " اس نے لہجے کو حد درجہ نارمل رکھا۔ صبر پر بولنا اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ بھی تب جب اس کی ماں کو مرے صرف دو دن ہی ہوئے تھے۔ وہ اذلان مصطفی تھا ۔ کوئی فرشتہ نہیں تھا وہ بس ایک با کردار مرد جس کی آنکھوں میں حیا اور چہرے پر نور تھا۔ اس نے بولنا شروع کیا تو سب لوگوں نے دم سادھ لیا۔ اس کے لفظ سحر پھونک دیتے تھے۔

" صبر صرف ایک لفظ نہیں، بلکہ ایک ایسا عظیم وصف ہے جو انسان کے ایمان کی گہرائی، اس کے یقین کی مضبوطی اور اس کے رب کے ساتھ تعلق کی سچائی کو ظاہر کرتا ہے۔ صبر کا مطلب صرف خاموشی سے دکھ سہہ لینا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے کو اس یقین کے ساتھ قبول کرنا ہے کہ جو کچھ میرا رب کرتا ہے، وہ میرے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے، خواہ میری محدود عقل اس کی حکمت کو اس وقت نہ سمجھ سکے۔ دنیا کی زندگی آزمائشوں کا گھر ہے، یہاں خوشیاں بھی امتحان ہیں اور غم بھی امتحان ہیں، فراخی بھی آزمائش ہے

اور تنگی بھی آزمائش ہے۔ لیکن ان تمام امتحانات میں کامیاب وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دل کو اللہ کی رضا سے وابستہ رکھتے ہیں اور اپنے لبوں کو شکوے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ صبر دراصل وہ خاموش عبادت ہے جس میں بندہ اپنی تکلیف لوگوں کے سامنے نہیں، بلکہ اپنے رب کے حضور رکھتا ہے، اور یہی بندگی کا سب سے اعلیٰ مقام ہے۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے بار بار صبر کا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ صبر ہر نیکی کی بنیاد اور ہر کامیابی کا راستہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اسْتَعِینُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاة ○ إِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِینَ"

(سورۃ البقرہ 2:153)۔

ترجمہ : "اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

غور کیجیے، اللہ تعالیٰ نے یہاں دولت، طاقت یا دنیاوی وسائل کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ صبر اور نماز کو کامیابی کا ذریعہ قرار دیا۔ اس آیت کی سب سے عظیم بشارت یہ ہے کہ اللہ نے

فرمایا: "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" جب خالقِ کائنات کسی بندے کے ساتھ ہو، تو پھر دنیا کی کوئی مشکل اس بندے کو شکست نہیں دے سکتی۔ اللہ کی معیت وہ نعمت ہے جو ہر خوف کو امن، ہر غم کو سکون اور ہر اندھیرے کو روشنی میں بدل دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی حقیقت بھی واضح فرما دی کہ آزمائش سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الأَمْوَالِ وَالأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ○ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ" (سورۃ البقرہ 2:155)۔

ترجمہ : "اور ہم ضرور تمہیں خوف، بھوک، مال، جانوں اور پھلوں کے نقصان سے آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آزمائشوں کی مختلف صورتیں بیان کیں، تاکہ انسان یہ جان لے کہ مشکلات زندگی کا حصہ ہیں، نہ کہ اللہ کی ناراضی کی علامت۔

پھر اللہ تعالیٰ ان خوش نصیب لوگوں کی پہچان بیان فرماتا ہے:

"الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" (2:156)۔

ترجمہ : "وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔"

یہ صرف زبان سے ادا کیے جانے والے الفاظ نہیں، بلکہ ایک ایسا عقیدہ ہے جو ٹوٹے ہوئے دل کو بھی اللہ کی طرف جوڑ دیتا ہے۔

اسی لیے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"أُولَـٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ" (2:157)۔

ترجمہ : "یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی رحمتیں اور عنایتیں ہیں، اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔"

صبر کی سب سے عظیم فضیلت یہ ہے کہ اس کا اجر اللہ تعالیٰ نے کسی میزان یا حساب کے ساتھ محدود نہیں فرمایا۔

"إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ" (سورۃ الزمر 39:10)۔

ترجمہ : "بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔"

دنیا میں ہر عمل کی ایک مقدار ہے، ہر محنت کا ایک معاوضہ ہے، لیکن صبر ایسا عمل ہے جس کی جزا خود اللہ کی بے پایاں رحمت کے سپرد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندے کی ہر خاموش آہ، ہر آنسو، ہر وہ رات جس میں وہ صرف اللہ کو پکار کر سو گیا، ہر وہ لمحہ جب اس نے انتقام کے بجائے برداشت کو چنا، ہر وہ درد جسے اس نے اللہ کی رضا کے لیے اپنے دل میں سمو لیا، اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ اللہ نہ کسی آنسو کو بھولتا ہے، نہ کسی دعا کو، نہ کسی زخمی دل کو، اور نہ کسی صابر بندے کی خاموش فریاد کو۔

قرآنِ مجید ہمیں حضرت ایوب علیہ السلام کی زندگی سے بھی صبر کا عظیم درس دیتا ہے۔ انہوں نے صحت کھو دی، مال کھو دیا، اولاد سے محروم ہوئے، مگر اللہ سے امید نہ توڑی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

"إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ○ نِّعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ" (سورة ص 38:44)۔

یعنی: "بے شک ہم نے انہیں صبر کرنے والا پایا، وہ بہترین بندہ تھا، بے شک وہ بہت رجوع کرنے والا تھا۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک عظمت دولت یا طاقت سے نہیں، بلکہ صبر، استقامت اور رجوع الی اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی بھی صبر کی لازوال مثال ہے۔ بیٹے کی جدائی میں برسوں آنسو بہائے، یہاں تک کہ بینائی متاثر ہوئی، مگر اللہ سے شکوہ نہیں کیا۔

انہوں نے فرمایا: "إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ" (سورۃ یوسف 12:86)۔

یعنی: "میں اپنا غم اور اپنی پریشانی صرف اللہ ہی سے بیان کرتا ہوں۔"

یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ صبر کا مطلب احساسات کو ختم کرنا نہیں، بلکہ اپنے غم کو اللہ کے سامنے پیش کرنا ہے، نہ کہ اس کی رحمت سے مایوس ہو جانا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی وعدہ فرمایا:

"فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ○ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" (سورۃ الشرح 94:5–6)۔

یعنی: "پس بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہے، بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے آسانی کے آنے کا نہیں، بلکہ دشواری کے ساتھ موجود ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ گویا ہر اندھیرے کے اندر روشنی کا ایک دروازہ پہلے سے رکھا جا چکا ہے، بس صبر کرنے والا اسے وقت آنے پر دیکھ لیتا ہے۔ صبر انسان کو کمزور نہیں بناتا، بلکہ اس کے کردار کو بلند کرتا ہے۔ غصے کے وقت خاموش رہنا صبر ہے، گناہ کا موقع ملنے کے باوجود اللہ کے خوف سے رک جانا صبر ہے، عبادت میں ثابت قدم رہنا صبر ہے، لوگوں کی تلخیوں کے جواب میں اخلاق اختیار کرنا صبر ہے، اور تقدیر کے فیصلوں پر اپنے رب سے حسنِ ظن قائم رکھنا بھی صبر ہے۔ صبر کا تعلق صرف مصیبت سے نہیں، بلکہ پوری زندگی سے ہے۔ بندہ جب اپنی خواہشات کو اللہ کے حکم کے تابع کر دیتا ہے، تو وہ صبر کے اعلیٰ درجے پر پہنچ جاتا ہے۔

آخرکار صبر کرنے والا کبھی خسارے میں نہیں رہتا۔ اگر دنیا میں اس کی دعا فوراً قبول نہیں ہوتی، تو اللہ اس کے لیے بہتر وقت مقرر کرتا ہے، اگر کوئی چیز چھن جاتی ہے، تو اللہ اس کے بدلے بہتر عطا فرماتا ہے، اگر کوئی دروازہ بند ہوتا ہے، تو اللہ ایسی راہیں کھول دیتا ہے جن کا بندہ نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔ مومن کا یقین یہی ہوتا ہے کہ اللہ کی ہر تاخیر میں حکمت ہے، ہر محرومی میں مصلحت ہے، ہر آزمائش میں تربیت ہے، اور ہر صبر

کے بعد رحمت ہے۔ اس لیے جب زندگی کے طوفان شدت اختیار کریں، دل ٹوٹ جائے، دعائیں دیر سے قبول ہوتی محسوس ہوں، اور راستے بند دکھائی دیں، تب بھی اپنے رب کا دامن نہ چھوڑو، کیونکہ اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ صبر کرنے والوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ صبر وہ چراغ ہے جو اندھیری راتوں میں بھی امید کی روشنی دیتا ہے، وہ قوت ہے جو شکست خوردہ دل کو پھر سے زندہ کر دیتی ہے، اور وہ عبادت ہے جس کا اجر نہ دنیا کی زبان بیان کر سکتی ہے اور نہ انسان کا تصور اس کی وسعت کو پا سکتا ہے۔ جو بندہ صبر کے ساتھ اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، وہ وقتی طور پر ضرور آزمایا جاتا ہے، لیکن آخرکار وہی اللہ کی رحمت، سکون، عزت اور دائمی کامیابی کا وارث بنتا ہے۔ شکریہ۔۔" اذلان سپیچ ختم کرکے وہاں سے چلا گیا۔ اسے پروفیسر طارق سے ان کے آفس میں ملنا تھا۔

☆~~~~~~~~~☆

باب 4 :

~ فریب ~

کہتے ہو۔۔

میں کرتی ہوں اداس باتیں؟

چلو آج یہ رسم توڑ دیتی ہوں۔

تم خوشیاں لے آو۔

میں اداسیاں چھوڑ دیتی ہوں۔

سنو !

خوشیاں لاو تو پوری لانا۔

آدھی ادھوری تو میں ویسے ہی چھوڑ دیتی ہوں۔۔۔!!

رات کے 10 بجے کا وقت تھا۔ عائشہ اپنے کمرے میں بیٹھی قرآن کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس کا فون تھرتھرایا تو اس نے قرآن بند کر کے اونچی جگہ رکھا۔ آیات پڑھتے اس کے لب ابھی تک ہل رہے تھے۔ فون میں لیتے اس نے سکرین کی جانب دیکھا۔ وہ کوئی سرکاری نمبر تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

" ہیلو۔۔عائشہ صدیقی بات کر رہیں ہیں ؟ " فون کے دوسری جانب سے روب دار آواز آئی۔

" جی ۔ " اس نے یک لفظی جواب دیا۔ اسے سمجھ نہ آیا مزید کیا کہے۔

" آپ کو میرا نام پتا ہے؟ " اس نے سوال کیا ۔ عائشہ نے الجھن سے فون کو دیکھا۔

" جی نہیں پتا۔ مجھے کیسے پتا ہوسکتا ہے؟ " وہ بولی ، فون پر دوسری جانب موجود شخص ہنس دیا۔

" میرا نام میر ہادی ہے۔" وہ بولا تو عائشہ چند لمحے سوچتی رہی کون ہادی ؟ پھر اس کی نظروں کے آگے وہ لڑکا آیا جسے اس نے چند ہفتوں پہلے ٹینس ائیرا میں اور اس کے بعد ایک دن نیوز میں دیکھا تھا۔ اوو ہاں !! وہ تو کراچی کے صدر میر گیلانی کا بیٹا تھا۔ چند لمحے وہ حیرت سے فون کو دیکھتی رہی ۔

" کیا واقعی ؟ " اس نے پوچھا۔ وہ پھر سے ہنس دیا۔ چہرے کا ڈمپل نمایاں ہوا۔ میر ہادی آج دن میں دو دفعہ ہنس دیا؟ یہ تو معجزہ تھا۔

" جی۔۔آپ نمبر سیو کر لیں۔ اگر کبھی بھی ضرورت پڑے تو یہ بندہ ناچیز حاضر ہے۔"
دوسری جانب سے فون رکھ دیا گیا۔ اسے یہ سب کچھ پروس کرنے میں وقت لگنا تھا۔ پھر بھی اس نے نمبر سیو نہیں کیا۔ وہ کھڑی ہوئی تو درد کی آہ نکلی۔ اس کے پاوں میں ابھی تک اس نیل کا نشان تھا۔ درد کم تھا ، مگر ابھی تک ہو رہی تھی۔ ابا آج گھر نہیں تھے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ باہر گئے تھے۔ شاید وہ لیٹ ہی گھر آتے۔ عائشہ سونے کے لیے اپنے کمرے کے بیڈ پر لیٹ گئی۔

دوسری جانب میر ہادی اپنے پینٹ ہاوس کی بالکنی میں کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے ان نیلی آنکھوں کا منظر جا ہی نہیں رہا تھا۔ چند لمحے بعد ہادی کا فون تھرتھرانے لگا۔ اس نے فورا فون دیکھا کہ شاید اس کا ۔۔۔مگر نہیں! وہ ابھی اتنا خوش نصیب بھی نہیں ہوا تھا۔

" ہیلو ہادی۔۔یار ہادی آرگنز والی ڈیل ڈن ہوگئی ہے۔ وہ ہمیں ایک ارب دینے پر بھی تیار ہیں۔ کچھ آرگنز کم تھے۔ ہمارے بندوں نے چند آدمیوں کو ڈنر نائٹ ریسٹورنٹ کے باہر سے اٹھا لیا ہے۔" ارسل اسے آگاہ کر رہا تھا۔ ہادی نے کوفت سے پہلو بدلا ، ابھی اس کی ماں کو مرے ایک دن ہوا تھا۔ یہ شخص دوسرے مردوں کو مروا رہا تھا۔ شاید وہ اپنے آپ

کو دوبارہ کاموں میں مصروف کررہا تھا لیکن پھر بھی۔ آہ ! اگر ہادی اسے بتا دیتا کہ اس کی ماں کو اس نے مروایا تھا تو؟؟ تھو تھو۔۔نہیں نہیں ۔ مسئلہ تو اس کے بھائی اذلان سے تھا ، ارسل سے تھوڑی تھا۔

" ہاں ٹھیک ہے۔ صبح افضل سے کہوں گا میں ڈاکٹر کو لے آئے گا۔ پھر نکالو لینا ان کے آرگنز بھی۔ ویسے ریسٹورنٹ کے باہر سے اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر کوئی دیکھ لیتا تو؟ اور ویسے بھی میں نے سنا ہے نیا اے سی پی بھرتی ہورہا ہے لاہور سے یہاں۔ اے سی پی بہرام ولید۔۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے کہا۔

" خیر ہے یار۔۔ان سب آدمیوں نے ہی تقریبا نشا کیا ہوا تھا۔ اور اس بہرام کو پوسٹ ہوتے ہوتے ابھی ڈیرھ ماہ تک لگ ہی جائے گا۔" ارسل نے ٹالا ۔

رات کے دو بجنے والے تھے۔ صدیقی گھر نہیں آئے تھے۔ ہاجرہ بی کا فکر سے برا حال تھا۔ عائشہ سو رہی تھی۔ صبح جب عائشہ جس وقت اٹھی تو اسے ہاجرہ بی نے بتایا کہ وہ کل سے گھر نہیں آئے۔ اگلے چند منٹ بعد ہاجرہ بی محلے کے ہی ایک لڑکے کے ساتھ تھانے رپورٹ کروانے گئی چلی تھیں۔ عائشہ کافی پریشان ہوئی تھی۔ اسی پریشانی میں وہ کالج آئی تھی۔کلاس سے فری ہوکر وہ کالج کے ہی ایک گرونڈ کے بینچ پر بیٹھ گئی تھی۔ آج ایمان

نہیں تھی۔ انہیں ساتھ مل سیم کیٹ کی تیاری کرنی تھی مگر وہ تھی کہ چھوٹی کر کے بیٹھ گئی تھی۔

اسے ابا کی فکر ہونے لگی ۔ وہ جیسے بھی تھے اس کے باپ تھے۔ اس موبائل فون پر وہ نمبر دیکھا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے کال ملائی۔

'' ہیلو۔۔'' وہ پریشان تھی اور اس کی پریشانی اس کی آواز سے ہی واضح تھی۔ دوسری جانب موجود شخص نے حیرت انگیز خوشی سے اس کا فون اٹھایا تھا۔

'' ہیلو۔۔مجھے یقین نہیں آرہا آپ نے مجھے خود کال کی ہے۔'' وہ بولا تو لہجے میں چاشنی گھل گئی۔

'' مجھے۔۔مجھے آپ کی مدد چاہیے۔۔'' وہ پریشان تھی ہادی نے نوٹ کیا تو وہ سنجیدہ ہوگیا۔

'' جی کہیں۔'' وہ میر ہادی ہی تھا نہ؟؟؟ لہجے میں اتنی نرمی؟ پاس کھڑے ارسل نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ میر ہادی جو ابھی چند منٹ پہلے اس پر چیخ رہا تھا ۔ وہ ایک فون کال کے آتے ہی اتنا نرم کیسے ہو گیا تھا؟

" میرے ابا کل رات سے گھر نہیں آئے۔۔اگر آپ کا کوئی جاننے والا پولیس میں ہے تو۔۔دراصل میں آپ کی مدد کبھی نہ مانگتی پر پولیس والے نے میری پھوپھو کی بات نہیں سنی۔" وہ تفصیل بتا رہی تھی مگر میر ہادی کے ماتھے پر تیوری چھڑی تھی۔ اتنی جرت کس کی تھی جس نے اس کے محبوب کو انکار کیا تھا۔

" پولیس والے کا نام یاد ہے آپ کو؟ اچھا چھوڑیں۔ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے والد کل رات کہاں تھے کچھ آئیڈیا ہے آپ کو؟ " ہادی کے ایک ہاتھ میں سگریٹ تھا جسے اس نے دور پھینک دیا۔ اسے عجیب لگ رہا تھا اس کا محبوب اس سے محو کلام تھا وہ کیوں غلط شے اس کے قریب پیے؟

" شاید۔۔ہاں۔۔ان کا نام نادر تھا۔ ابا کل رات ڈنر نائٹ ریسٹورنٹ میں ان کے دوستوں کے ساتھ ان کی دعوت تھی۔" عائشہ کے منھ سے نکلے انفاظ تھے کہ میر ہادی یک دم پتھر کا ہوا تھا۔ اس نے بے یقینی سے فون کی جانب دیکھا۔ اسے ساکت کرنے والی شے یہ خیال نہیں تھا کہ اس کا باپ شاید بیسمینٹ میں ہوگا۔ اس کو ساکت کرنے والی شے یہ احساس تھا کہ اگر اس کے باپ کو کچھ ہو گیا تو وہ کس تکلیف سے گزرے گی۔ یہ ایک ایسا احساس تھا جو میر ہادی کو اپنی زندگی میں پہلی آیا تھا۔ وہ تکلیف میں ہوتی تو میر

ہادی کیسے نہ تکلیف میں ہوتا؟ ارسل اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ میر ہادی نے آج تک کسی شے سے خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر کیسا خوف تھا جو یک دم اس کے چہرے پر آگیا تھا۔

" میں۔۔آپ کے پاس۔۔اپنے والد کی کوئی تصویر ہے تو مجھے بھیج دیں۔" اس نے گہرا سانس خارج کرتے کہا۔

" اوکے۔" دوسری جانب سے فون رکھ دیا گیا۔ہادی نے فون رکھتے ہی غصے سے ارسل کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

" ارسل ابھی بیسمینٹ جاو اور اس آدمی کو وہاں سے لے کر آؤ۔ " اس نے روب دار آواز میں حکمیہ لہجے سے کہا۔ وہ اسے صدیقی کی تصویر دکھا رہا تھا جو عائشہ نے بھیجی تھی۔

" مگر۔۔۔مگر ہادی جب کوئی ایک بار بیسمینٹ میں چلا جائے ہم اسے زندہ نہیں نکالا کرتے۔۔یہ تمہارا ہی اصول تھا۔" ارسل نے اسے کہنا چاہا مگر ہادی نے غصے سے اسے دیکھا۔

" ابھی ۔ اور۔ اسی۔ وقت۔ جاو۔ مجھے وہ زندہ چاہیے! " اس نے حکمیہ کہا۔

'' مگر ہادی۔۔تمہارے اصول۔۔'' ارسل پھر سے ٹالنا چاہا۔

'' اس لڑکی کے لیے میر ہادی اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ یہ اصول کوئی معانی نہیں رکھتے۔'' ہادی نے دوسری جانب مڑتے کہا۔ اس کے ذکر پر ہی ہادی کا غصہ کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ ارسل نے اس بھوکے شیر کو مزید چھیڑنے سے بہتر اس کا کام کرنا ہی ضروری سمجھا۔

☆~~~~~~~~~☆

اذلان پروفیسر طارق کے آفس میں جارہا تھا جمعہ کے دن وہ جا نہیں سکا تھا سو آج جا رہا تھا۔ جاتے جاتے اس کی نگاہ کیفے کے باہر بڑی سی ایل ای ڈی پر گئ۔ وہاں ایک خبر زور و شور سے گردش کر رہی تھی۔

'' نظرین آپ کو بتاتے چلے کہ دو دن قبل کراچی کے صدر میر گیلانی اور ان کی اہلیہ رات کے وقت کار ایکسیڈنٹ میں مارے گئے۔ رپورٹ کے مطابق وہ دونوں میاں بیوی ڈنر سے واپس آرہے تھے۔ گاڑی ٹرک سے ٹکرائی تھی اندھیرے کے باعث ڈرائیور دیکھ نہ سکا اور یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ ڈرائیور کا بیان ریکاڈر کرلیا گیا ہے جو کہ اس وقت زخمی حالت

میں ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ مزید یہ کہ اگلے چند میں وٹنگ کے ذریعے نیے صدر کراچی کو منتخب کیا جائے گا۔"

وہ خبر بار بار دہرائی جا رہی تھی۔ اذلان کو برا لگا تھا۔ وہ جیسے بھی تھے ان کے باپ کے دوست تھے۔ اس نے زیر لب کچھ آیات پڑھ کر ان کے لیے دعا کی۔ اگلے چند لمحوں بعد پروفیسر طارق کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

" مجھے سکون نہیں مل رہا، کہیں بھی سکون نہیں ہے۔ میں نے پچھلے چند دنوں میں ہر روز قرآن ختم کیا ہے۔ مجھے پہلے جیسا سکون نہیں مل رہا۔ " وہ اپنی حالت بیان کررہا تھا۔ اذلان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید وہ پچھلے چند دن سے سو بھی نہیں سکا تھا۔

" اذلان آپ کو یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قرآن بے شک سکون ہے۔ مگر جس مرض میں آپ مبتلا ہیں وہ ڈپریشن ہے۔ آپ کو اس کا سہی سے علاج کروانا چاہیے۔" سفید چھوٹی داڑھی، بال سفید تھے، چہرے پر کہیں کہیں جھریاں نمایاں تھیں۔ کہتے ہیں انسان کا کام بولتا۔ ان کے نیک اعمال بولتے تھے۔ انہوں نے غور سے اذلان کے چہرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا نور کہیں کھو سا گیا تھا۔ وہ پر نور چہرہ کہاں گیا تھا؟

" میں نے کل رات ایک خواب دیکھا۔۔وہ خواب بہت مختلف تھا میں سمجھ نہیں سکا۔ "
اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی ، وہ پریشان تھا۔

" کیا دیکھا آپ نے اذلان ؟ " وہ اس پوچھ رہے تھے۔ وہ بیان کیے بنا نہیں رہ سکا۔

رات کے 2 بجے کا وقت تھا۔ وہ اپنے ہاسٹل کے کمرے میں بیڈ پر سو رہا تھا۔ بہت مشکل سے اس کی آنکھ 1 بجے کے قریب لگی تھی۔ نیند کی گہری وادیوں میں سوئے اس نے جو دیکھا وہ حیران کن تھا۔

ایک سیاہ جنگل تھا۔ جس کے درمیان میں ایک سنسان سڑک تھی۔ دونوں جانب درخت ہی درخت تھے۔ سیاہ رات نے ہر جگہ اپنے پر پھیلا رکھے تھے۔ وہ سڑک کے بیچ و بیچ کھڑا تھا۔ اس کے ماتھے پر لوہے کی زنجیر بندھی تھی۔ شاید وہ اپنی سوچوں کا قیدی تھا۔ پھر اس نے دائیں جانب والے درختوں میں ہل چل ہوتی محسوس کی ۔ وہاں ایک لڑکی سیاہ چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ اس کی بس نیلی آنکھیں واضح تھیں۔ باقی چہرہ چھپا ہوا تھا۔ وہ لڑکی غور سے اذلان مصطفی کے وجود کو دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شاید وہ اداس تھی ۔ پھر وہ لڑکی ذرا سی آگے آئی تو اس کا وجود واضح ہوا۔ ایک لمبی لوہے کی زنجیر اس کے ہاتھ سے بندھی تھی۔ وہ زنجیر اتنی لمبی اور موٹی تھی کہ اس کا ہاتھ اس

زنجیر سے آزاد نہیں ہورہا تھا۔ باقی کی زنجیر پر زمین پر گری ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے اوپر کی جانب دیکھا اس کی نیلی آنکھیں اذلان مصطفی کی شہد رنگ آنکھوں سے ٹکرائی۔ دونوں کا درد حد سے سوا ہوا ۔ درد اذلان مصطفی کی برداشت سے باہر ہوا تو وہ گہرے سانس لیتا اٹھ بیٹھا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے گہرے سانس لیے ، کمرے میں اندھیرا تھا ۔ اسے سانس لینے میں مزید مشکل محسوس ہوئی۔ اسے اندھیرے سے خوف آیا۔ اس نے بیڈ سے اتر کی لائٹ آن کرنی چاہی پر وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ وہ پھر سے اٹھا اور لائٹ آن کی۔ سانس درست کی اور جلدی سے ٹیبل پر پڑا پانی پیا۔

" میرا یہ خواب کس طرف اشارہ کر رہا ہے ؟ " اذلان نے اپنے ماتھے پر آئی پسینے کی بوندیں صاف کیں۔

" کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جو شیطان دیکھاتا ہے ، کچھ خواب فریب ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ خواب ہمیں مخصوص سمت میں چلنے کا اشارہ دیتے ہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولے۔

" اگر یہ کسی سمت اشارہ کر رہا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے ؟ " وہ طلب جواب تھا۔

" انتظار۔ کسی کے تمہاری زندگی میں آنے کا انتظار۔" وہ اب اٹھ کھڑے ہوئے۔

چھٹیاں ختم ہونے میں ایک مہینہ باقی تھا۔ ایک مہینے بعد نئے میڈیکل سٹوڈنٹس نے آنا تھا۔ تب تک پروفیسر طارق کو یونیورسٹی کچھ کام دیکھنے تھے۔

☆~~~~~~~~☆

جب عائشہ واپس گھر آئی تو اس کے بابا گھر آ چکے تھے۔ اس نے پہلی بار کسی شخص سے مدد مانگی تھی ، پہلی بار ہی اس شخص نے اس کی مدد کر دی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی وہ کون تھا جو یک دم سے اس کی زندگی میں آیا تھا۔ عائشہ نے نیوز پر دیکھا تھا میر ہادی کو کراچی کا نیا صدر منتخب کر دیا گیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی ایک اتنا امیر شخص بنا کسی مطلب کے اس کی مدد کیوں کر رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا وہ اس کا شکریہ ادا کر کے اس سے دوبارہ بات نہیں کرے گی۔ ہاجرہ بی اور ابا صحن میں بیٹھے تھے۔ وہی پولیس والا نادر ابا کو گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ ساتھ میں اس نے ہاجرہ بی سے معذرت بھی کی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئی تو ابا نے گہری آنکھوں سے عائشہ کو دیکھا۔ ابا کی آنکھیں لال تھیں، شاید جب وہ کل غائب ہوئے تھے تب نشے میں تھے۔ عائشہ کو ان سے پھر سے گھن آئی۔ وہ ہاجرہ بی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ابا ہاجرہ بی کو بتا رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے ان کو اور ان کے دوستوں کو بے ہوش کردیا تھا۔ جب ابا ہوش میں واپس آئے تھے تب وہ آج دوپہر پولیس

سٹیشن کے باہر تھے۔ پولیس والوں نے وہیں سے ابا کو گھر پہنچایا تھا۔ وہ سب اس بات سے بے خبر تھے کہ ابا کو تو بیسمینٹ بھیج دیا گیا۔ اس سے پہلے کے ڈاکٹر آرگنز نکالتا ارسل وہاں پہنچ چکا تھا۔ انہیں بے ہوش حالت میں ہی ارسل کے آدمی وہاں سے پولیس سٹیشن کے باہر پھینک گئے تھے۔ ہاجرہ بی اب ان کے زخم دیکھ رہیں تھیں۔

" یہ سب کچھ اس لڑکی کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ کم بخت جب سے زندگی میں آئی ہے جہنم ہو گئی ہے زندگی۔" وہ عائشہ کو غصے سے دیکھتے بولے۔ وہ سہم کر پیچھے ہوئی۔وہ اپنے کمرے میں آگئی ۔ ابا باہر دکان تک چلے گئے۔ وہاں وہ اکثر آدمیوں کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ اس نے ہادی کا نمبر سیو کر لیا تھا نجانے کیوں؟ وہ اب اس کا نمبر ملا رہی تھی۔ اس نے اتنا کیا تھا عائشہ کے لیے اس کا شکریہ کہنا تو بنتا تھا۔ چند لمحوں بعد فون اٹھا لیا گیا تھا۔

" اسلام و علیکم۔۔میں عائشہ بات کر رہی ہوں۔" اس نے نرم لہجے میں کہا اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ میر ہادی مسکرا دیا۔ بھلا وہ اسے بھول سکتا تھا ؟ جو وہ اپنا تعارف کروا رہی تھی۔

'' جی جانتا ہوں۔ آپ کا نمبر سیو ہے میرے پاس۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ جب بھی اس سے بات کرتا تھا میر ہادی کے لہجے میں شاشنی گھل جاتی تھی نجانے کیوں؟

'' وہ آپ کا شکریہ۔۔ابا گھر آگئے ہیں۔'' وہ لہجہ حد درجہ نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ وہ کراچی کے صدر سے بات کررہی تھی اسے یقین کرنا مشکل تھا۔

'' شکریہ کیسا ؟ شہزادیاں شکریہ نہیں کہتیں۔ ویسے ایک بات کہوں ؟ آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں بلکل کسی سمندر جیسی۔'' وہ لبوں پہ مسکراہٹ سجائے بولا۔

'' شکریہ۔۔'' وہ بلش کر دی نجانے کیوں؟ جب عائشہ کو احساس ہوا کہ وہ بلش کر رہی ہے تو اس نے فورا کال کاٹ دی۔ یہ تو بس آخری کال تھی۔ اس نے سوچا۔

'' اور پھر جب محبتیں اپنوں کی بجائے غیروں سے ملنے لگیں تو بڑی تباہیاں ہوتی ہیں۔''

ہر انسان کے دل میں محبت کی طلب رکھی گئ ہے۔ یہ طلب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک پاکیزہ فطرت ہے، مگر اسی فطرت کا امتحان بھی یہی ہے کہ وہ اپنی محبت کو کس سمت میں لے جاتا ہے۔ محبت اگر اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہو تو رحمت بن جاتی ہے اور اگر انہی حدود سے تجاوز کر جائے تو آہستہ آہستہ ایک ایسی آزمائش میں بدل جاتی ہے جس کی زنجیریں آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتیں، مگر روح کو جکڑ لیتی ہیں۔

نامحرم سے محبت کبھی اچانک انسان کو قید نہیں کرتی۔ یہ ہمیشہ ایک دھوکے، ایک خوش گمانی، اور ایک خوبصورت احساس کے پردے میں آتی ہے۔ شیطان کبھی انسان کے سامنے گناہ کو بدصورت بنا کر پیش نہیں کرتا ۔ بلکہ اسے محبت، خلوص، سمجھ داری، یا قسمت کا نام دیتا ہے۔ وہ انسان کے دل میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ "یہ دوسروں جیسا تعلق نہیں"، "ہماری نیت صاف ہے"، "ہم صرف ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں"، "ہم تو آخرکار نکاح ہی کرنا چاہتے ہیں۔

یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان حقیقت سے زیادہ اپنے جذبات پر یقین کرنے لگتا ہے۔پھر ایک سلام سے بات شروع ہوتی ہے، چند پیغامات کا تبادلہ ہوتا ہے، معمولی سی گفتگو عادت بن جاتی ہے، عادت ضرورت میں بدل جاتی ہے، اور ضرورت ایسی وابستگی اختیار کر لیتی ہے کہ انسان اپنی خوشی، اپنا سکون، اپنے فیصلے، بلکہ اپنی عبادت تک اس ایک شخص کے گرد گھمانے لگتا ہے۔ اسے محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ محبت نہیں کر رہا، بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایسی زنجیر میں بندھ رہا ہے جس کا ہر حلقہ اس کی آزادی کو کمزور کرتا جا رہا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ یہ سب محبت نہیں فقط ایک جھانسا ہے۔ جو پہلے پہل خوبصورت خواب لگتا ہے ، لیکن جب حقیقت کھولتی ہے اس وقت پتا چلتا ہے وہ تو ایک

جھانسا تھا۔ ایک ایسا جھانسا جس نے اسے زنجیر کا قیدی بنا دیا تھا۔ اس زنجیر کا عادی ، جس سے نکلنا اب مکمن نہیں۔

یہ زنجیر لوہے کی نہیں ہوتی، احساسات کی ہوتی ہے۔

یہ ہاتھوں کو نہیں، دل کو باندھتی ہے۔

یہ قدموں کو نہیں روکتی، مگر انسان کی روح کو ایک ایسی قید میں ڈال دیتی ہے جہاں ہر لمحہ اس کا دل اسی شخص کی موجودگی یا غیر موجودگی سے وابستہ رہتا ہے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی پہلا خیال اسی کا، رات سوتے وقت آخری دعا بھی اسی کے لیے۔ اس کا ایک پیغام پورے دن کو روشن کر دیتا ہے، اور اس کی خاموشی انسان کے دل میں اندھیرا بھر دیتی ہے۔ یوں آہستہ آہستہ انسان اپنی خوشی کی چابی اللہ کے بجائے ایک بندے کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ ہمارے آج کے زمانے میں ٹین ایج لڑکے لڑکیاں یہی کرتے ہیں اور غلط کرتے ہیں۔

نامحرم کی محبت تو وہ غلامی ہے جس کی تباہی کا احساس اکثر بہت دیر سے ہوتا ہے۔

نامحرم سے تعلقات کا سب سے بڑا فریب یہی ہے کہ وہ ابتدا میں سکون محسوس کرتا ہے ، مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہی سکون بے چینی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انسان ہر وقت

انتظار میں رہنے لگتا ہے۔ جواب کا انتظار، کال کا انتظار، ملاقات کا انتظار، توجہ کا انتظار، یقین دہانی کا انتظار۔ اس کی زندگی انتظاروں کی ایک لمبی زنجیر بن جاتی ہے۔

پھر حسد جنم لیتا ہے۔

شک پیدا ہوتا ہے۔

دل بے وجہ گھبرانے لگتا ہے۔ ہر نئی تاخیر ایک خوف بن جاتی ہے، اور ہر نئی بے توجہی ایک زخم۔ یہ وہ کیفیت ہے جسے اکثر لوگ محبت کا نام دیتے ہیں، حالانکہ یہ محبت سے زیادہ دل کی قید ہوتی ہے۔ حقیقی محبت انسان کو مضبوط بناتی ہے، جبکہ ناجائز وابستگی انسان کو کمزور کر دیتی ہے۔

"نامحرم کی محبت ایک قید سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔"

وہ انسان جو کبھی اپنے فیصلے خود کرتا تھا، اب ایک شخص کے رویے سے اپنی قدر کا اندازہ لگانے لگتا ہے۔ اگر اسے اہمیت ملے تو خود کو قیمتی سمجھتا ہے، اور اگر نظر انداز کر دیا جائے تو خود کو بے وقعت محسوس کرتا ہے۔ گویا اس کی عزتِ نفس بھی ایک ایسے شخص سے وابستہ ہو جاتی ہے جسے اللہ نے ابھی اس کے لیے حلال بھی نہیں بنایا۔

اس سے بڑھ کر قید اور کیا ہو سکتی ہے؟

سب سے زیادہ نقصان صرف دل کو نہیں ہوتا، ایمان کو بھی ہوتا ہے۔

یہ کیفیت اس لمحے کے بعد پیدا ہوتی ہے جب انسان اللہ کی آواز کے بجائے اپنے نفس کی آواز کو ترجیح دیتا ہے۔ شیطان کی سب سے کامیاب چال یہی ہے کہ وہ انسان کو گناہ سے محبت کروا دیتا ہے۔ جب گناہ محبوب بن جائے تو انسان توبہ کو گناہ سمجھنے لگتا ہے۔ اسے نصیحت سخت محسوس ہوتی ہے، مگر گناہ آسان لگتا ہے۔ اسے اللہ کی حدود قید محسوس ہوتی ہیں، جبکہ اپنی خواہشات آزادی دکھائی دیتی ہیں۔

حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔

اللہ کی حدود آزادی ہیں، اور نفس کی خواہشات سب سے بڑی غلامی۔

جو دل اللہ کے علاوہ کسی اور کی محبت میں اس حد تک گرفتار ہو جائے کہ اس کی خوشی، اس کا سکون، اس کی عبادت اور اس کی شخصیت سب اسی کے گرد گھومنے لگیں، وہ دل آزاد نہیں رہتا۔ وہ قیدی بن جاتا ہے، چاہے دنیا اسے محبت کا نام ہی کیوں نہ دیتی رہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر ناجائز تعلق کا انجام شادی نہیں ہوتا، لیکن تقریباً ہر ناجائز تعلق اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی ٹوٹا ہوا دل، پچھتاوا، احساسِ جرم، یا ایسی یادیں ضرور

چھوڑ جاتا ہے جن سے نکلنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تعلق کھو دیتے ہیں، اور کچھ اس تعلق کی وجہ سے خود کو۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے محبت سے منع نہیں فرمایا، بلکہ محبت کو ایک پاکیزہ راستہ عطا فرمایا: نکاح۔ کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ دل کتنی جلدی وابستہ ہو جاتا ہے، اور کتنی مشکل سے آزاد ہوتا ہے۔ اسی لیے اس نے ان تمام راستوں کو بند کیا جو انسان کو آہستہ آہستہ ایسی زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں جنہیں وہ ابتدا میں زنجیر سمجھتا ہی نہیں۔ اگر آج تمہارا دل کسی نامحرم سے بندھا ہوا ہے، تو یہ سوچنے کے بجائے کہ لوگ کیا کہیں گے یا وہ شخص کیا سوچے گا، ایک لمحے کے لیے یہ سوچو کہ اللہ کیا کہے گا۔ وہ تمہارے دل کی ہر کیفیت جانتا ہے، تمہاری ہر کمزوری سے واقف ہے، اور تمہاری ہر تڑپ کو سمجھتا ہے۔ اگر تم اس کی رضا کے لیے کسی ایسے تعلق کو چھوڑ دو جو اس نے پسند نہیں کیا، تو یہ نقصان نہیں، ایک ایسی تجارت ہے جس کا نفع دنیا کے ہر تعلق سے بڑا ہے۔

" جنہیں اللہ کافی ہو جائے وہ کسی انسان کی کمی میں تباہ نہیں ہوتے۔"

شام سات بجے کے قریب کا وقت تھا۔ ابا اپنے کمرے میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ہاجرہ بی کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ عائشہ ان سے ذرا فاصلے پر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

صحن میں اندھیرا ہونے لگا۔ اس نے بلب آن کیا۔ چند منٹ بعد ابا باہر آئے اور ساتھ والی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

" عائشہ ! ابا کو کھانا دو۔ " ہاجرہ بی نے عائشہ سے کہا ۔ وہ اٹھی ہاتھ میں ابا کا کھانا لیا اور ان کی چارپائی پر رکھا۔ پھر سالن لے کر چند منٹ بعد واپس آئی۔ فرش کا سیمنٹ کہیں کہیں سے ٹوٹا ہوا تھا ۔ اس کا پاوں مڑتے مڑتے بچا وہی پاؤں جس پر پچھلی بار کا نیل ابھی تک موجود تھا۔ خود کو تو اس نے بچا لیا مگر اس کے ہاتھ میں پکڑا سالن ابا کے پاؤں پر گر گیا۔ وہ درد سے تڑپ اٹھے۔ جلدی سے ٹھنڈا پانی اوپر ڈالا۔ تپش سے سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ جو زندگی میں سیاہ رنگ گھول دیتی تھی کم بخت۔

" یہ جان کر کیا ہے نہ تو نے عائشہ!!؟؟؟ کم بخت مر کیوں نہیں جاتی تو۔ عذاب بن گئی ہے میرے سر پر۔ " انہوں نے عائشہ کے اسی زخمی پاوں پر اپنا بیلٹ دے مارا۔ وہ درد سے تڑپی۔ ہاجرہ بی فورا ان تک آئیں۔ ابا کو روکنا چاہا مگر ابا نے ان کی ایک نہ سنی۔ وہ تب تک عائشہ کے پاؤں پر بیلٹ مارتے رہے جب تک وہ تھک نہ گئے۔ اس کا پورا پاؤں نیل و نیل ہو چکا تھا۔ لال اور پرپل کا امتزاج۔ وہ کتنی دیر روتی رہی درد برداشت سے باہر ہوتی رہی۔

ابا یہ کیوں بھول گئے تھے کہ ہماری insecurities ہمارے گھر سے شروع ہوتیں ہیں۔ ابا یہ کیوں بھول گئے تھے کہ اپنے دکھ میں کسی اور کا دل نہیں دکھاتے۔ ابا یہ کیوں بھول گئے تھے کہ انسان کی اکڑ، رب کی پکڑ پر ختم ہو جاتی ہے۔ ابا یہ کیوں بھول گئے تھے کہ بیٹیوں کا دل دکھانے میں سب سے بڑا ہاتھ ان کے اپنے گھر والوں کا ہوتا ہے۔

اور عائشہ صدیقی یہ کیوں بھول گئی تھی کہ اللہ ہر قریبی رشتے کی اوقات دکھا کر بتاتا ہے کہ " بتا کون ہے تیرا میرے سوا ؟ " وہ یہ کیوں بھول گئی تھی کہ اسے غلط راہ پر نہیں چلنا تھا پر وہ چل پڑی تھی ایک ایسی زنجیر کی جانب جس سے وہ کئی سالوں تک نہ نکل پاتی۔ نامحرم کی محبت سے بڑی زنجیر بھی آج تک کوئی ہوئی ہے بھلا۔

☆~~~~~~~~~~☆

یہ بیسمینٹ کا منظر تھا۔ ہادی اور ارسل لوڈنگ کا کام کروا رہے تھے۔ ہادی بڑی سنجیدگی سے کام کروانے میں مصروف تھا۔ آج انہیں آرگنز سپین میں سمگل کروانے تھے۔ چند لمحے گزرے تو میر ہادی کا موبائل تھرتھرانے لگا۔ اس نے بے زاری سے سکرین کو دیکھا پل بھر میں اس کی نرمی آئی ۔ سکرین پر Mine کا نام جگ مگ کر رہا تھا۔ اس نے

مسکراتے ہوئے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ پاس کھڑے ارسل سے کوفت سے اسے دیکھا۔ ہادی نے اسے عائشہ کے بارے میں سب بتایا تھا۔ ارسل کو یقین آگیا تھا کہ محبت نے میر ہادی جیسے انسان کو بھی کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

" ہیلو ڈیر پرنسیس۔۔کیسی ہیں آپ ؟ " وہ مسکرا کر گویا ہوا۔ یہ تیسری کال تھی جو عائشہ نے خود ہادی کو کی تھی۔ ہواؤں میں اڑنا تو بنتا تھا۔ اگلے ہی پل وہ زمین بوس ہوا۔ عائشہ رو رہی تھی۔

" ہا۔۔ہادی۔۔" وہ ہمت جوڑ کر آنسو ضبط کرتی صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ ہادی اس کی آواز کی نمی پہچان گیا تھا۔

" کیا ہوا ہے عائشہ؟ سب ٹھیک ہے نہ تم ٹھیک ہو نہ؟؟؟ " وہ یک دم بہت پریشان ہو گیا تھا۔ میر ہادی بھی پریشان ہو سکتا تھا ؟ کلفٹن پارک کی درد ناک ہواؤں نے دم سادھ لیا۔ ان کا مالک نرم کب ہوا تھا ؟ ہادی نے ارسل کو کام سنبھالنے کا اشارہ کیا اور خود گاڑی کی چابی لے کر گاڑی فراٹے سے وہاں سے لے گیا۔ سنسنان سڑک سے اس کا رخ عائشہ کے گھر کی جانب تھا۔

" وہ۔۔وہ میں بس۔۔اداس ہوں امی کو مس کر رہی تھی۔" اس نے اپنے آنسو صاف کرتے کہا۔ وہ ہادی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دل میں ایک درد سا اٹھا ۔ وہ پریشان ہو گا تو وہ چین سے کیسے رہے گی؟ اس شخص سے عائشہ کو عجیب سا لگاو ہونے لگا۔

" میں آؤں تمہارے پاس؟؟ بتاو میں آجاتا ہوں۔" اس کے لگلے الفاظ تھے اور عائشہ نے دم سادھ لیا۔ اگر ابا کو پتا چل جاتا تو وہ اس کی جان لے لیتے۔

" نہیں نہیں۔۔۔پلیز آپ مت آئیں۔" اس نے فورا کہا۔ ہادی نے نوٹ کرلیا تھا وہ کسی سے ڈر رہی تھی۔ مگر اس نے بات کو زیادہ نہیں کھینچا ۔ گاڑی روڈ کے کنارے پارک کر دی۔

" اوکے۔۔نہیں آؤں گا۔ آپ اپنا خیال رکھیں۔ کیا ہم کل مل سکتے ہیں؟ " وہ التجا کر رہا تھا۔ میر ہادی التجا کر رہا تھا؟

" اوکے ہادی۔" عائشہ نے کہا۔ میر ہادی یک دم شل ہوا۔ ساکت۔۔دل زور سے دھڑکا۔

" پلیز۔۔پلیز عائشہ ایک بار پھر میرا نام لے سکتی ہو؟ " وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔ کلفٹن پارک کی خوفناک ہواؤں کے منہ شاکی سے کھلے رہ گئے۔ میر ہادی کسی کی منت بھی کر سکتا تھا۔

" ہادی۔۔" وہ آنسو صاف کرتے بولی ۔ وہ یک دم روتے روتے ہنس دی۔ مقابل شخص اسے پاگل لگا۔ وہ یہ کیوں بھول گئی تھی کہ محبت میں لوگ پاگل ہو جایا کرتے ہیں۔

وہ شخص جس نے اپنی زندگی میں خون کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا ۔ وہ شخص اب محبت دیکھ رہا تھا اور اس کا اسیر ہو رہا تھا۔ عائشہ نے کال کاٹ دی۔ چند لمحوں بعد ہادی نے اسے ایک فائیو سٹار ریسٹورنٹ کا اڈریس اور وقت بھیج دیا۔

اگلے دن عائشہ ریسٹورنٹ میں آگئی تھی۔ چند دن بعد عائشہ کا ایم کیٹ کا پیپر تھا۔ اسے تیاری بھی کرنی تھی ۔ سو وہ یہاں آنے سے پہلے کچھ تیاری کر آئی تھی۔ سیاہ شلوار قمیض پر سیاہ ہی چادر لیے وہ اندر آئی تو اسے وہ کہیں نظر نہ آیا۔ اس کی نیلی آنکھیں میر ہادی کو تلاش کر رہیں تھیں۔ وہ تو نظر نہ آیا ، البتہ ایک فیمیل ویڑ نے عائشہ کو ریسٹورنٹ کے وی ائی پی سکیشن کے ایک ٹیبل پر بیٹھا دیا۔ شاید وہ لیٹ تھا۔ چند لمحوں بعد اسے وہ آتا دکھائی دیا۔ عائشہ نے آج پہلی بار اس کی شخصیت پر غور کیا تھا۔ وہ سیاہ تھری پیس میں ملبوس تھا۔ شاید کسی میٹنگ سے ہو کر آیا تھا۔ بال جیل سے پیچھے کو سیٹ تھے۔ سیاہ آنکھیں عائشہ کو دیکھتے ہی نرمی میں ڈوب گئیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آکر بیٹھا۔ ڈمپل نمایاں ہوا۔ آہ ! زندگی میں پہلی بار عائشہ کو کسی کا ڈمپل اتنا حسین لگا تھا۔

" ہیلو ڈیر پرنسیس۔" وہ بیٹھتے ساتھ بولا۔ میر ہادی نے اپنی زندگی میں ہر طرح کی لڑکی دیکھی تھی۔ مگر کسی لڑکی میں اس طرح کی سادگی بھری کشش شاید ہی دیکھی ہو۔

" ہیلو۔۔" وہ نروس تھی۔

" کیا آپ مجھے جانتی ہیں مس عائشہ؟ " وہ مسکرا کر بولا۔ وہ ایسا اعتراف سننا چاہتا تھا جیسا وہ اپنے آپ سے کئی دفعہ کرچکا تھا۔ وہ عائشہ سے محبت کرتا تھا۔

" ہاں۔" وہ نرمی سے بولی۔ مگر یہ اعتراف تو نک تھا۔ اس نے منھ بنا لیا۔

" اچھا کون ہوں میں؟ " وہ اس کی نیلی آنکھوں میں دیکھتے بولا۔

" وہی جس سے میں نے محبت کی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ یہ وہ کس رہ چل پڑی تھی؟ ایسی تو نہیں تھی وہ۔ وہ اسے اپنا خوبصورت خواب سمجھ رہی تھی ، وہ یہ کیوں بھول گئی تھی کہ خواب حقیقت نہیں ہوا کرتے۔ وہ بھی ایسے خواب جن کی شروعات ہی آپ کو کئی زنجیروں سے باندھ دے۔ ہادی نے کھانے کا آرڈر دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھا۔ لاشعوری طور پر اس کی نگاہ عائشہ کے پاؤں پر پڑی تھی تو اس کو تیوری چڑ گئی۔ نیل اس کے سفید پیر پر بہت واضح تھا۔

" عائشہ کس نے کیا ہے؟ " لہجہ حکمیہ تھا ۔ شاید وہ شخص حکم دینے کے لیے ہی بنا تھا۔

" یہ--یہ وہ۔میں گر گئی تھی کل---" اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔

"آپ کو تو جھوٹ بھی بولنا نہیں آتا۔" اس نے لہجے کو حد درجہ نرم رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھا عائشہ کو ویٹ کرنے کا اشارہ کیا اور وی آئی پی سکیشن سے غائب ہوا۔-چند لمحے عائشہ وہیں بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہی۔ چند منٹوں بعد اس نے ہادی کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ وہ اس کے پاس آیا مگر کرسی پر نہیں بیٹھا۔ وہ اس کے سامنے ریسٹورنٹ کے فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کا پاؤں اپنے ہاتھ میں لیا۔

اس نے باکس میں سے بام نکالا اور ہلکے ہاتھ سے اس کے نیل والی جگہ پر مالش کرنے لگا۔ وہ کتنی ہی دیر اس کے قدموں میں بیٹھا ہلکے ہاتھ سے مالش کرتا رہا۔ ہادی نے عائشہ کے پاؤں اپنی آنکھوں سے لگائیں تھے۔ کوئی شخص کسی کے پاؤں چھو سکتا ہے۔ مگر آنکھوں سے لگا سکتا ہے؟؟ منظر عجیب تھا مگر دلفریب بھی۔ وہ مغرور شخص جس نے آج تک اپنی جوتی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ اب اس نیلی آنکھوں والی شہزادی کے پاؤں میں جوتی ڈال رہا تھا۔

عائشہ نے حیرت سے ہادی کو دیکھا۔ چند لمحے اسے سمجھ نہیں آیا ۔ وہ خوش نصیب تھی یا بد نصیب؟؟ کیا اس کے پیروں کی زنجیریں ٹوٹ رہی تھیں یا مزید سخت ہو رہیں تھیں؟

رات کو ہادی پینٹ ہاوس پر آیا تھا۔ لاونج میں صوفے پر بیٹھتے اسے اپنی اور عائشہ کی نیلی آنکھیں اس کے ذہن کی سکرین پر رنگ بھرنے لگیں تو وہ مسکرا دیا۔ وہ آج کل بلا وجہ مسکرانے لگا تھا۔

بس اس کی آنکھیں دیکھیں، باقی کچھ یاد نہیں۔

یوں لگا جیسے کائنات میں اور کوئی بات نہیں۔

میں قاتل سہی ، پر محبت میں مجبور ہوں۔

اس کی آنکھوں کے سامنے ، میں بے سور نہیں۔

چند لمحوں بعد رحمان اندر داخل ہوا ۔ دروازہ نوک کیا تو ہادی آنکھیں کھولیں۔

" سر۔۔پتا چل گیا ہے۔" اس نے کہا تو ہادی نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

" تو پھر بتاؤ کس نے اپنی موت کا سامان کیا ہے؟ کون تھا وہ جس نے عائشہ کو مارا تھا؟" اس نے رحمان کو جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

" سر محلے کے کچھ لوگوں سے پتہ چلا ہے کہ ان کے والد صدیقی عائشہ پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔اس کے علاوہ ایسا کوئی بھی نہیں ہے ۔ جہاں تک ان کے والد کی بات رہی تو یہ بھی پتا چلا ہے کہ وہ نشہ کرتا ہے۔ " وہ اب تفصیلات بتا رہا تھا۔ ہادی نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

" نشہ تو کرتا ہے یہ تو جب ارسل کے آدمیوں نے اسے اغوا کیا تھا تب ہی پتا چل گیا تھا۔ ٹھیک ہے تم جاو۔۔اگر اسے کوئی نقصان دینا ہوا تو میں تمہیں بتا دوں گا۔" ہادی نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ رحمان سر کو خم دیتا وہاں سے چلا گیا۔

ہادی کئی لمحے یوں ہی بیٹھا سوچتا رہا۔ آنکھیں بند کیے اس نے عائشہ کے الفاظ یاد کیے تو وہ پھر سے مسکرا دیا۔ " وہی جس سے میں نے محبت کی ہے۔"

" کیسے ہو میر ہادی۔۔" ایک آواز نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ اسے چیڑ ہوئی۔ سامنے مصطفی ابراہیم اپنے پورے قد سے کھڑا تھا۔

" تمہارے سامنے ہوں۔" روب دار آواز میں کہا گیا۔

" مجھے پاگل سمجھتے ہو ہادی ؟ تم میرا ایک بھی فون نہیں اٹھا رہے تھے۔ میں جانتا ہوں تم نے ہی اپنے باپ اور تبسم کو مروایا ہے۔ اتنا بھی بے خبر نہیں ہوں میں۔" وہ ضبط کے میرے بولے تھے۔

" آواز نیچے رکھ کر بات کیجئے مصطفی صاحب۔ اور آپ کو کس نے یہ حق دے دیا کہ آپ میری مرحومہ آنی کو نام سے بلائیں؟ میر ہادی بھی اتنا بے خبر نہیں۔ " وہ روب دار جتانے والے انداز میں بولا۔

" اچھا۔۔ کیا خبر ہے تمہیں؟ " مصطفی ابراہیم کو لگا تھا وہ میر ہادی سے دو ہاتھ آگے تھے مگر بات یہ تھی کہ انہیں صرف لگا تھا۔ وہ تبسم کو استعمال کر کے اس دھندے پر قبضہ کرنے چاہتے تھے۔ مگر وہ بھول گئے تھے کہ میر ہادی بھی کسی شر کا نام تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟ میں نہیں جانتا آپ کے کیا تعلقات تھے آنی سے ؟ ظاہر ہے صرف اس لیے تو نہیں مارا اس زہریلی بوڑھیا کو کہ وہ میری ماں کی قاتل تھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس عمر میں بھی میرے باپ سے بے وفائی کر رہی تھی۔" میر ہادی ان کے سامنے آکر کھڑا ہوا تو وہ چند قدم پیچھے ہوئے۔ وہ میر ہادی تھا۔ کسی کو بھی ایک نظر میں خوف کے زیر اثر لا سکتا تھا۔

" خبردار --جو مجھے مارنے کی کوشش کی تو--" مصطفی ابراہیم ڈر کے پیچھے ہوئے۔ میر ہادی کا زور دار قہقہہ پورے پینٹ ہاوس میں گونجا۔ ہوائیں خوف سے ایک جانب کو چل دیں۔

" فکر مت کرے مصطفی صاحب۔ آپ کو نہیں ماروں گا تب تک جب تک آپ اپنے ہاسپٹلز میں سے آرگنز سمگل کرواتے رہے گے۔اس لیے

Be a good boy and do what I say."

وہ ہنستا ہوا اپنے سگریٹ کے کش لگتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کیوں بھول جاتا تھا کہ اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہے۔

" رزق کی خاطر لباس گندا کرنا، ضمیر گندا کرنے سے بہتر ہے۔"

☆~~~~~~~~~☆

" ابا کہاں ہیں؟ " عائشہ نے ہاجرہ بی کو اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر پوچھا۔

" سو رہے ہیں۔ کتنی کر لی ؟ کل اچھا سا پیپر دینا۔ اللہ میری بچی کو کامیاب کرے گا انشاءاللہ۔" ہاجرہ بی اس کے سر پر بوسا دیتیں اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ وہ جو پڑھنے میں مصروف تھی ان کو دیکھ کر ہلکا مسکرا دی۔

"آج کل بہت خوش ہو۔ کیا بات ہے ؟ " وہ اسے غور سے دیکھتے بولی۔

" ہاجرہ بی۔۔" اس نے سوچا وہ ان کو بتا دے۔

" کیا میرا نصیب اچھا ہوگا؟ میں جب بھی شادی کا سوچتی ہوں مجھے خوف آتا ہے۔ اگر ابا جیسا کوئی مل گیا تو کیا ہو گیا میرا؟ " وہ اداسی سے بولی۔ جانتی تھی اگر ایم کیٹ پاس نہ ہوا تو ابا اس کی کسی بھی ایرے غیرے سے شادی کر دے گے۔

" دیکھنا ایک دن آئے گا جب تمہاری سب پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔" وہ اس کے ماتھے پر ہلکے ہاتھ پھیرتی بولیں۔

" اچھا پھر۔۔پھر کیا ہوگا ؟ " اس نے ان کی گود میں سر رکھے ان کی جانب دیکھتے پوچھا۔

" پھر کیا ؟ اللہ تمہیں قدر دانوں کے حوالے کر کے پوچھے گا۔

(فَبِأَيِّ آلاَءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ) " وہ مسکرا کر بولیں۔ اس کے ماتھے پر پھر سے بوسا دیا۔ وہ بھی مسکرا دی ۔ خیالوں میں وہ شخص گرداش کرنے لگا۔ ہاں وہی جس کی آنکھیں سیاہ تھیں۔

" می می۔۔میں کسی کو پسند کرتی ہوں۔" اس نے ہاجرہ بی سے کہا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

" کون ہے۔۔وہ ؟ " ان کے لہجے میں خوف تھا۔ انھوں نے ایسی پرورش تو نہیں کی تھی اس کی۔

" میر ہادی۔" الفاظ تھے یا چابق وہ سمجھ نہ پائیں۔

" وہ۔۔وہ۔میر ہادی جو نیا۔۔؟ " وہ اسے ایسے دیکھے گئیں جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔

" جی ۔ آپ کو پتا ہے ابا کو چھڑوانے میں بھی اس نے ہی مدد کی تھی۔" وہ ان کو بتا رہی تھی۔ ہاجرہ بی کو سمجھ نہ آیا وہ کیا کریں۔

" اس سے دور ہو جاو عائشہ۔ نا محرم کی محبت بس تباہیاں ہی لاتی ہے۔ " وہ اسے سمجھانا چاہ رہی تھیں ۔ مگر آہ ! قسمت نوجوان نسل کو لگتا ہے بڑے تو ایسے ہی کہتے ہیں۔ ہمیں کیا ہی ہو جائے گا ایک محبت سے ؟

" کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بہت اچھا ہے می می۔" وہ اب مسکرا رہی تھی۔ ہاجرہ بی کو اس کی مسکراہٹ سے خوف آیا۔ یا خدا انہیں اس کے آنے والے کل سے خوف آیا۔

" دعا کر عائشہ تیرا نصیب میرے جیسا نہ ہو۔ ورنہ تیری زندگی کے کئی سال ضائع ہو جائیں گے۔" وہ بولی تو لہجے میں سب تھا۔ بے چارگی، بے بسی۔۔سب۔ بس اسے محبت کی راہ سے روکنے کی کوئی زنجیر نہیں تھی۔

"آنی آپ کو پتا ہے وہ کیسا ہے؟" وہ ان کی جانب دیکھتے بولی۔

"کیسا ہے؟" وہ اسے کن آنکھوں سے دیکھ رہیں تھیں یہ بس وہی جانتی تھیں۔

" وہ ایسا ہے کہ۔۔

اس سے محبت کرنے کے لیے زندگیاں ادھار لی جا سکتی ہیں۔

وہ ایسا ہے کہ۔۔

اسے سامنے بیٹھا کر تمام عمر دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کی وہ آنکھیں اتنی حسین ہیں کہ!!

ایک سو اڑسٹھ چاند کی راتیں صدقہ واری جاسکتی ہیں۔"

وہ کھڑکی سے باہر اب اس چاند کو دیکھ رہی تھی۔ ہاں وہاں تو اس کا محبوب بھی تھا۔ اس کا محبوب کتنا خوبصورت تھا۔ خوبصورت تو چاند بھی تھا۔ مگر خوبصورتی سے کیا ہوتا ہے؟

خوبصورتی نے کہاں پتا چلنے دیا تھا؟ کہ تاج محل فقط ایک قبر ہے۔

کتنے قصے ہیں نہ کہ کتنی خوش نصیب تھی وہ عورت جس کے لیے تاج محل بنوایا گیا تھا۔ وہ خوش نصیب تھی؟ اس کی زندگی میں ہی اس کے شوہر کئی شادیاں کر رکھی تھیں۔ اس کی ہر بیوی کے لیے کچھ نہ کچھ تھا۔ زندگی میں تو اس کا شوہر اس کے لیے کچھ نہ کرسکا۔ مرنے کے بعد اس کی قبر پر تاج محل کھڑا کر دیا۔ یہ خوش نصیبی تھی؟ یہ تو وہ بد قسمتی تھی جو صدیوں سے ساتھ ہے۔ نور جہان نے کہاں دیکھی تھی تاج محل کی خوبصورتی۔ اس نے تو سب زندگی میں دکھ دیتے تھے۔

تو پھر سے وہی سوال ۔ کہ خوبصورتی سے کیا ہوتا ہے جناب؟ زنجیر تو تب بھی تھی، اب بھی ہے۔ فقط ایک چابی پانے سے کیا ہوتا ہے جانب؟

نفرت نے باندھی سانسوں کی زنجیر۔۔

محبت آئی اور توڑ گئی تقدیر۔۔

☆~~~~~~~~~☆

اذلان آج اپنے کچھ کلاس فیلوز کے ساتھ اسلام آباد کے ایک چھوٹے سے قصبے میں میڈیکل کیمپ لگانے آیا تھا۔ چھٹیاں ختم ہونے میں ابھی کافی دن باقی تھے۔ ان کے پاس اچھا موقع تھا اپنے سکیلز کو چیک کرنے کا، اس طرح ان کی اچھی پریکٹس بھی ہو جاتی اور غریب قصبے کے لوگوں کو مفت میں علاج بھی مل جاتا۔ دو دو لڑکوں نے اپنے گروپ بنا لیے تھے۔ یہ قصبے کا ایک کھلا میدانی علاقہ تھا۔ جہاں ذرا ذرا فاصلے پر چھوٹے چھوٹے مکان بنے نظر آتے تھے۔ ہر گروپ نے قصبے کے مختلف حصوں میں اپنا ٹیبل لگا لیا تھا۔ جب کہ اذلان اور اس کا دوست میسم ابھی تک ٹیبل ہی سیٹ کر رہے تھے۔

" اذلان یار وہ بیگ دینا زرا۔" میسم نے اس کی جانب دیکھتے کہا۔ اذلان کو ٹیبل پر اپنا سامان سیٹ کرنے میں مصروف تھا۔ اس کی آواز پر غصے سے اسے دیکھنے لگا۔ میسم ایک کونے میں بیٹھا سیب کھانے میں مصروف تھا۔

" موٹے کبھی کہ خود بھی کچھ کر لو۔ تمہارے باپ کا نوکر نہیں ہوں میں۔" اذلان چیڑ کر بولا۔ میسم نے تیوری سے اسے دیکھا۔ وہ صحت میں تھوڑا موٹا تھا۔ ہاں۔۔بس تھوڑا ہی۔ ایسا اسے ہی لگتا تھا۔

" اچھا کیمپ کے بعد نہ ہم کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھانے چلے گے اذلان پلیز۔۔"

وہ ایسی معصومیت سے بولا کہ گویا اس نے صدیوں سے کچھ کھایا ہی نہ ہو۔ میسم اور اذلان کی ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ وہ دونوں کافی اچھے دوست تھے۔

" سانڈ کہیں کہ پہلے ہاتھ میں پکڑا سیب تو کھا لو۔" وہ غصے سے بولا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ کام کے موڈ میں تھا۔ سو یہ میسم کو اشارہ تھا کہ وہ چپ رہے۔ سامنے بوڑھے آدمیوں اور عورتوں کی قطار تھی۔ اسے باری باری سب کو چیک کرنا تھا۔

" جی بتائیں چچا ۔۔کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ ؟ " وہ اس بوڑھے آدمی کی جانب دیکھتے بولا جو تقریبا 80 سے اوپر کے معلوم ہوتے تھے۔

" پتر ہڈیاں پیڑ کر دیاں نے۔" وہ ایسے بولے کے پہلے تو اذلان سمجھ ہی نہ سکا۔ اس نے بے ساختہ میسم کو دیکھا۔ ہاں میسم پنجابی تھا نہ۔

" وہ کہہ رہے ہیں کہ ہڈیاں درد کرتی ہے پتر۔" میسم نے ہنستے ہوئے اذلان سے کہا۔

اذلان نے اسے ایک گھوری سے نوازا اور واپس ان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ انہیں چند ایک سپلیمنٹس دی۔ وہ مسلسل کئ گھنٹے وہاں بیٹھا ہر ایک کی بات سنتا رہا۔ یہاں تک کہ تمام سٹوڈنٹس وہاں سے جا چکے تھے۔ شام ہونے کو تھی ، صرف اذلان اور میسم ہی وہاں رہ

گئے تھے۔ وہ تب تک وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا جب تک وہ ہر ایک کی فریاد نہ سن لیتا۔ جاتے ہوئے اذلان نے ایک بہت بڑی رقم ان پر خرچ کر کے انہیں کھانے پینے کا صاف سامان فراہم کیا تھا۔

شام کے سات بجے کے قریب وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے آئے تھے۔ میسم تو بہت خوش تھا کہ آج بل کے پیسے اذلان دے گا۔ دراصل ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ اذلان میسم کا بل خود پے کرتا تھا۔ اسے عادت تھی کہ جو کھائے وہی بل دے۔

" سر آپ کیا آڈر کرے گئے؟ " ویٹر اذلان کے پاس آکر کھڑا ہوا۔

" میرے لیے آپ ہاف چیکن کڑاہی کر دے اور ساتھ روگنی نان۔۔اور ان سے پوچھ لیں یہ کیا کھائیں گے۔" اذلان نے میسم کی جانب اشارہ کیا۔ اذلان روکھے کھانوں سے بہت چیڑ ہوتی تھی۔ وہ اکثر گروی یا پھر شوربے والے کھانے کھایا کرتا تھا۔ اگر وہ بریانی بھی کھاتا تھا تو رئتہ اس کی پلیٹ میں اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ بریانی پرسکون انداز میں کھائی جا سکتی تھی۔ اگر وہ فاسٹ فوڈ کھاتا تھا تو ساتھ سوس کا ایک کینٹر علیحدہ لے لیتا تھا۔

میسم اپنا آرڈر ایسے لکھوا رہا تھا جیسے ہر چیز مفت ہو۔ اذلان جانتا تھا وہ یہ سب اسی لیے کر رہا تھا کیونکہ اسے لگا تھا کہ بل اذلان دے گا۔ مگر اسے تو صرف لگا ہی تھا۔ اس میں

اذلان کا کیا قصور تھا؟ اذلان نے لبوں پر مسکراہٹ سجائے کندھے اچکائے۔ کھانا کھاتے ہوئے دونوں ہی مصروف تھے ۔ ان دونوں کو ہی کھانے کے دوران باتیں کرنے کی عادت نہیں تھی۔ سچ کہتے ہیں۔۔دوستوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی کئی عادتیں ایک جیسی نکل ہی آتی ہیں۔

" سر یور بل ۔" جب وہ کھانا کھا چکے تو ویٹر ان کے پاس دو بل لے کر آیا ۔ ایک اذلان کا اور ایک میسم کا۔ میسم نے حیرت سے اذلان کو دیکھا۔ اذلان اس ریسٹورنٹ میں ریگولر کسٹمر تھا۔ شاید وہ جانتے تھے اذلان بل ایسے ہی بنواتا تھا۔

" یہ پے کرے گا آج۔" میسم نے اذلان کی جانب دوسرا بل کر دیا۔

" اپنا بل خود میسم۔ میرے پاس حرام کا پیسے نہیں ہے۔" اذلان اپنا بل دیتا اٹھ کھڑا ہوا۔

" تمہارے باپ کا تو ہے نہ۔" وہ بڑبڑاتا ہوا اپنا بل دیتا اس کے ساتھ باہر آیا۔

" میں نے آج تک اپنے باپ کے پیسے پر گزار نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں وہ حرام کا پیسہ ہے۔ سیاست میں کس کا پیسہ حلال کا ہوتا ہے؟ " وہ استہزایہ مسکرا کر بولا۔

اذلان نے کالج سے لے کر ایم بی بی ایس کی پڑھائی تک سکولر شیپ پر کی تھی۔ دوسرے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میل نرس کے طور پر اسلام آباد کے مختلف ہاسپٹلز میں کام کر چکا تھا اور کر رہا تھا۔ وہ محنتی تھا یہی اس کی کامیابی تھی۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ باپ ہیلت منسٹر ہے تو عیش کی جائے۔ وہ پیسہ اسے حرام کا لگتا تھا۔ وہ ان کے کالے دھندوں کے بارے میں نہیں جانتا تھا لیکن پھر بھی اسے الجھن محسوس ہوتی تھی۔ شاید وہ جان جاتا اگر وہ زیادہ وقت گھر رہا ہوتا مگر اپنی زیادہ زندگی اسلام آباد میں گزارنے کے بعد اسے اس سب سے فرق ہی نہیں پڑتا تھا ۔ وہ خود کما رہا تھا ، خود کو حرام سے دور رکھ رہا تھا ۔ اسے اور کسی شے کی طلب نہیں تھی۔

☆~~~~~~~~~~~☆

" نانو بہت تھک گیا میں آج۔" اذلان نے اس چھوٹے صحن والے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وانچی آواز میں کہاں۔ وہ جانتا تھا اس کی نانو اس کا نتظار کر رہیں ہوگی۔ وہ صحن کے پاس چولہے پر روٹیاں بنانے میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ آج جمعرات تھا۔ اذلان ہر جمعرات کو ان کے پاس رہا کرتا تھا۔ اس کچے گھر

میں داخل ہونے سے پہلے وہ اپنی تمام امیری کہیں چھوڑ آتا تھا۔ اذلان نے ساری زندگی مکان دیکھے تھے۔ اونچے ، علیشان مکان ، لمبے بڑے مکان۔ پر بات تو یہ تھی کہ وہ بس مکان تھے ، گھر نہیں تھے۔ گھر تو یہ تھا جہاں اس کی نانو تھی۔ گھر تو وہی ہوتا ہے نہ جہاں سکون ہو؟ اور ماں کی آغوش کے بعد وہ گھر تو نانی کا ہی ہوتا ہے نہ ؟ ساری زندگی اذلان مصطفی نے ایسے ہی ایک گھر کی اپنے لیے تمنا کی تھی۔ وہ ان کے پاس بیٹھا تو انہوں نے بنا کچھ سوچے سمجھے اس کے آگے ایک چنگیر (روٹیاں رکھنے والی پلیٹ نما تنکوں کی بنی ہوئی) رکھ دی۔ جس میں دو روٹیاں تھیں۔ اس کے قریب سالن کی پیالی رکھ دی۔ وہ 70 سالہ عورت عمر کے لحاظ سے کافی کافی صحت مند تھیں۔ وہ ستر کی لگتی نہیں تھی ۔ عمر میں چھوٹی لگتی تھیں۔

اذلان بنا کچھ کہے ان کے پاس نیچے چٹائی پر بیٹھ گیا اور کھانا کھانے لگا۔ وہ باہر سے کھانا کھا آیا تھا ۔ مگر کیا فرق پڑتا تھا اگر وہ ان کو خوش کرنے کے لیے تھوڑا اور کھا لیتا ؟

" کیسے گزرا دن ؟ " وہ اب اس سے ساری تفصیل ہر بار کی طرح پوچھ رہیں تھیں۔ آج اس نے کیا کیا ، کہاں گیا ، کس کے ساتھ رہا۔ وہ انہیں ساری تفصیل بتاتا رہا۔ انہیں کچھ بھی بتانے مختلف کوفت محسوس نہیں کرتا تھا۔

رات کے 10 بج رہے تھے۔ یہ گرمیوں کے دنوں کی شروعات تھی۔ دو چارپائیوں پر بستر اذلان نے ہی بچھائے تھے۔ مگر ایک چارپائی خالی تھی ۔ دوسری پر نانو بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں سرسوں کے تیل کی شیشی تھی۔ فرش پر الٹی پالتی مارے اذلان ان کے بلکل آگے بیٹھا تھا۔ وہ اس کے بالوں میں تیل لگا لگا کر مالش کر رہیں تھیں۔

"آپ کو نانا کی یاد نہیں آتی نانو ؟ " وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔

"تیری زیادہ آتی ہے۔" وہ مسکرا کر بولیں تو چہرے پر پڑی چند جھریاں نمایاں ہوئیں۔

" یہ تو آپ نانا سے بے وفائی کر رہیں ہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔

" شرارتی کہیں کا ۔۔مت بول ایسے۔" انھوں نے پیار سے اس کے سر پر چت لگائی۔

" مطلب پیار تو کرتیں ہیں آپ نانا سے ۔" نانو اب اس کا سر دبانے لگی تھیں۔ اس نے سکون سے آنکھوں موند لیں۔ وہ اس جوان مرد کا چہرہ دیکھنے لگیں جو رنگت گندمی رکھنے کے باوجود بھی اتنا پرکشش تھا کہ اس پر سے نظر نہ ہٹتی۔ چند ہفتوں پہلے والی اداسی اس کے چہرے پر اب کم واضح ہو رہی تھی جو اس کی ماں کے انتقال کے وقت تھی۔ اس کے چہرے کا وہ نور جو ماند پڑنے لگا تھا ، پھر سے اس کے چہرے کو روشن کرنے لگا تھا۔ کتنا خوبصورت لگتا تھا نہ وہ جب بھی اس کے چہرہ پر نور چمکتا تھا۔

" ایسے نہ دیکھیں نانو۔۔آپ کو مجھ سے پیار ہو جائے گا۔" اس نے آنکھیں کھول کر انہیں چھیڑا۔

" دیکھنا اذلان۔۔اللہ تمہیں ایسی لڑکی سے نوازے جو تمہارے مکان کو بھی گھر بنا دے۔" انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسا دیتے کہا۔ وہ انہیں کیسے بتاتا ۔ کہ ایک نیلی آنکھوں والی لڑکی اس کے خوابوں میں آتی تھیں۔ جو اس کی مدد کی طلب گار تھی۔ اگر وہ کسی اور کا ہوگیا تو اس کو کون بچائے گا۔

"پتا نہیں کہاں ہے وہ۔۔" اس نے کہا شہد رنگ آنکھوں کے آگے وہ نیلی آنکھیں آئی۔

" وہ معجزوں کا بادشاہ ہے۔ وہ جب چاہے جیسے چاہے نواز دیتا ہے۔ تجھے اس لڑکی سے بھی نواز دے گا جس کے لیے تیری ان شہد رنگ آنکھوں میں انتظار کا موتی ہے۔ بس یہ دعا کرنا کہیں وہ آتے آتے ساتھ ان زنجیروں کو بھی نہ کھینچ لائے جو اس کے ساتھ ہیں۔" وہ عجیب سے انداز میں بولیں، اذلان سمجھ نہ سکا۔ اس نے رخ موڑ لیا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں :

قرآن پاک میں ایک ایسی آیت بھی ہے، جو ظالم کے دل میں تیر اور مظلوم کے دل پر رکھا ہوا مرہم ہے۔

سننے والے نے پوچھا: وہ کون سی؟

آپ نے فرمایا:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ○

اور تیرا پروردگار بھولنے والا نہیں۔

☆~~~~~~~~~☆

" کیسی تیاری ہے پیپر کی؟ " ایمان اس کے ساتھ ساتھ چلتے بول رہی تھی۔

" دیکھنا پاس ہو کر ہی نکلو گی۔ ہادی خوش ہو جائے گا۔" عائشہ مسکرا کر بولی۔ ایمان کو ہادی نام سے ہی کوفت ہونے لگی تھی۔

" یہ آدمی بلکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی بتا رہی ہوں تمہیں بعد میں مت کہنا وارن نہیں کیا۔" ایمان نے اسے سمجھاتے کہا۔ وہ دونوں کالج کے باہر بینچ پر بیٹھی تھیں۔ آدھے گھنٹے بعد ان کا پیپر تھا۔

" تم سب کو آخر مسئلہ کیا ہے ہادی سے ؟ اتنا اچھا ہے وہ۔ " عائشہ نے نوٹس پر غور کیا۔

" نا محرم کی محبت تباہی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں لاتی عائشہ۔ وقت ہے ابھی بھی چھوڑ دو اسے۔ " ایمان نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے سمجھتے کہا۔

" چھوڑو یہ سب۔۔ تمہارا کیا ہے تم تو خوش ہو نہ اپنے اس منگیتر بہرام ولید کے ساتھ۔" عائشہ نے منھ بناتے کہا۔

" خوش ؟ رہنے ہی دو عائشہ۔ بہرام کی اور میری منگنی بچپن سے تھہ ہے۔ اور ہم نے تو آج تک ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کی۔ نہ ہی تمہاری طرح آدھی رات تک فون سے چپک کر پیار بھری باتیں کی ہیں۔

جو لڑکیاں راتوں کو ایسے باتیں کرتی ہیں نہ عائشہ ان کی زندگی سے خوشیاں روٹھ جاتی ہیں۔ اپنی ہاجرہ بی پر ہی یقین رکھ لو۔ کئی دفعہ ہمارے بڑوں کے فیصلے غلط نہیں ہوتے عائشہ۔ ہاجرہ بی تمہارے لیے ایک بہترین شخص کو چنے گی ۔ یہ سب چھوڑ دو۔" وہ اسے سمجھا رہی تھی مگر وہ سمجھ کب رہی تھی ؟

" مجھے کوئی اور نہیں چاہیے نہ۔۔ہادی چاہیے۔ تم نے آج تک کسی سیاست دان کو اتنا سچا ، اتنا پاک دیکھا ہے ؟ نہیں نہ ؟ مگر وہ ہے۔ وہ غریبوں کا خیال رکھتا ہے تم نے نیوز پر نہیں دیکھا ؟ " وہ چہرے کے کہنی جمائے بولی۔

'' ہر دکھتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ وہ سب دکھاوا ہے عائشہ۔ تم اس کے بارے میں صرف اچھائیاں دیکھ رہی ہو۔ اس کے بارے میں کتنی افواہیں ہے جانتی ہو نہ تم؟ پھر بھی؟ '' ایمان نے اس کا چھوڑتے کہا۔

'' بس افواہیں ہی ہیں وہ۔ مجھے پورا اعتبار اس پر۔۔ وہ کبھی بھی مجھ سے کچھ چھپا ہی نہیں سکتا۔ یہ آرگنز سمگلنگ وغیرہ یہ سب تو افواہیں ہی ہیں۔ اسے دیکھ کر لگتا ہی نہیں کہ وہ قاتل بھی ہو سکتا ۔ وہ شخص جو میرے لیے میرے قدموں میں بیٹھ سکتا ہے۔ وہ ایسا تو کبھی نہیں کرسکتا۔ مجھے پورا اعتبار ہے اس پر۔ وہ میرا بھروسہ کبھی نہیں توڑے گا۔'' ایمان نے بے بسی سے عائشہ کو دیکھا۔ کیا سچ میں پیار اتنا اندھا ہوتا ہے؟ شاید ہوتا ہے۔ سامنے والی کی ہر برائی دور جا سوتی ہے۔ آپ کو بس اس کی اچھائیاں ہی نظر آتی ہیں۔ مگر جب برائیاں غلبہ پاتی ہیں تو سارے خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ حقیقت کھل جاتی ہے اور پردے ہٹ جاتے ہیں۔

پیپر کے بعد ایمان عائشہ سے نہیں ملی۔ وہ ویسے ہی گھر چلی گئی تھی۔ ویسے بھی جب سے عائشہ نے ہادی کے ساتھ رہنا شروع کیا تھا ایمان پر کافی سختی کی جارہی تھی۔ اس کے بابا نہایت نرم مزاج تھے مگر باپ تو باپ ہوتا ہے۔ انہیں ہر گز گوارا نہیں تھا کہ ایمان

عائشہ کی صحبت میں رہتی۔ عائشہ نے بھی ایمان سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے تو وہ کبھی بھی ایسے نہ جاتیں۔

☆~~~~~~~~~~☆

" رزلٹ کس دن ہے؟ " رات کو عائشہ اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ فون کان سے لگائے وہ ہادی سے بات کر رہی تھی۔

" کل ہے۔" عائشہ نے بتایا۔

"گڈ۔۔اس کے بعد میں خود تمہارا ایڈمیشن کنفرم کروا دوں گا۔" ہادی نے ٹی وی کی آواز کم کرتے کہا۔

" ہادی۔۔کیا وہ۔افواہیں سچ ہیں؟ جو آپ کے بارے میں۔۔" اس سے پہلے کے عائشہ کچھ اور کہتی ہادی نے اس کی بات بیچ میں کاٹ دی۔

" تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے نہ؟ تو ایسے مت سوچنا۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں جس سیٹ پر ہوں وہاں میں کئی دشمن بھی ہیں۔ مجھے گرانے کے لیے ایسی افواہیں پھیلاتے ہیں۔" ہادی نرمی سے اسے سمجھایا۔

'' ہاں۔۔ بھروسہ تو ہے پر۔۔پلیز آپ میرا بھروسہ مت توڑیے گا۔'' وہ التجا کر رہی تھی۔ میر ہادی کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ اسے نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ بتا دیتا تو وہ کبھی اس سے شادی نہ کرتی اور وہ تو اسے کل پرپوز کرنا چاہتا تھا۔

'' اگر یہ سب سچ ہوا تو ؟ '' اس نے پوچھا۔ یوں گویا مذاق کر رہا ہو۔

'' تو میں آپ کو چھوڑنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاؤں گی میر ہادی۔'' جواب سنجیدگی سے دیا گیا۔

'' اچھا ؟ اتنا آسان ہے تمہارے لیے مجھے چھوڑنا ؟ '' اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

''آسان تو نہیں ہے۔۔ تبھی تو اب تک اپنا ضمیر مار کر آپ کے ساتھ ہوں۔'' اس نے اپنا ضمیر مارا تھا ؟ کیا وہ اتنا برا تھا ؟

'' مطلب کیا ہے تمہارا ؟ '' ہادی نے سنجیدگی سے پوچھا۔ لہجے میں درد تھا۔

'' مطلب یہ کہ میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا تھا یوں ہر رات آپ سے باتیں کرنا ، آپ نا محرم ہیں میرے۔ میرا دل دکھتا ہے ، اپنا ضمیر مار کر آپ کے ساتھ ہوں میں۔ مجھے دھوکہ مت

دیجئے گا۔ بڑے اپنوں کی باتیں رد کر کے ، ان پر اعتبار نہ کر کے صرف اور صرف آپ پر اعتبار کیا ہے میں نے۔" وہ سنجیدہ تھی یا خوف زدہ میر ہادی سمجھ نہ سکا۔

" نہیں توڑوں گا۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور فون کاٹ دیا۔

کتنی ہی دیر وہ یوں ہی اپنے کمرے کی چھت کو تکتا رہا۔ ہاں وہ نہیں توڑے گا اس کا اعتبار۔ وہ اسے پتا ہی نہیں لگنے دے گا۔ وہ اس لڑکی کھونے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

اگلے دن عائشہ کا رزلٹ تھا۔ وہ کالج آئی تھی۔ ایمان شاید نہیں آئی تھی سو وہ اسے کہیں نظر نہ آئی۔ عائشہ کا نام پر میرٹ پر آگیا تھا۔ مگر نمبر تھوڑے کم ہونے کی وجہ سے کراچی کی یونیورسٹی میں نام نہیں آیا تھا۔ البتہ اسلام آباد کی دو یونیورسٹیوں میں نام آیا تھا۔وہ بہت خوش تھی کہ گھر سے دور جا کر پڑھے گی تو گھر کے مسئلوں سے بھی دور رہے گی۔ اسے کیا پتا تھا زندگی کیا کھیل کھیلنے والی تھی۔

" ہیلو۔۔عائشہ بہت بہت مبارک ہو۔" ہاجرہ بی نے اسے فون کیا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں۔

" تھینک یو می می۔۔آپ کو بھی مبارک ہو۔ اگر آج آپ نہ ہوتی تو میں اس مقام پر کبھی نہ ہوتی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

" گھر کب تک آو گی؟ " عائشہ نے گہرا سانس لیا۔ اسے جھوٹ بولنا تھا۔ آج اسے ہادی کے ساتھ ڈنر کرنا تھا۔

" می می میں آج ایمان کے گھر ڈنر کر کے آؤں گی۔ چلی جاؤں پلیز ؟ " وہ التجا کر رہی تھی۔

" اچھا ٹھیک ہے۔۔مگر آٹھ بجے تک گھر آجانا۔" انھوں نے پیار سے کہا۔

عائشہ کو برا لگا تھا مگر وہ کیا کرتی۔ محبت کرنا غلط نہیں ہے ، اس محبت کے لیے غلط قدم اٹھانا غلط ہے۔ عائشہ نے بھی غلط قدم اٹھایا تھا۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ہادی اسے کراچی بیچ پر لایا تھا۔ بیچ اس حصے سے خالی تھا۔ شاید وہ آدھا بیچ بک کروا چکا تھا۔ عائشہ کی دونوں آنکھوں پر پٹی باندھ کر وہ اسے یہاں لایا تھا۔ وہ اسے پرپوز کرنا چاہتا تھا۔ بیچ کے اس آدھے حصے کو اس نے لال گلابوں سے بے حد خوبصورتی سے سجایا تھا۔ ڈیکوریٹر اپنا کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ عائشہ کی آنکھوں پر اس نے سیاہ پٹی باندھ دی تھی۔اب اسے وہ ڈنر ٹیبل کے کنارے تک لایا۔ عائشہ اس کا ہاتھ تھامتی آگے ہوئی۔ ہادی نے

عائشہ کو دیکھا۔ اسے آج تک کوئی لڑکی اتنی حسین نہیں لگی تھی ، جتنی چادر میں لپٹی وہ ایک لڑکی لگ ہی تھی۔ وہ لڑکی اس کے دل پر حکمرانی کرنے لگی تھی۔ وہ ظالم حیوان انسان بننے لگا تھا۔ کیا واقعی ؟ اس نے عائشہ کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی وہ یک دم ساکت ہوئی۔ میر ہادی اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ڈائمنڈ کی رنگ تھی۔ چاروں اطراف لگے لال گلاب بہت خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے۔ اس کے لگلے الفاظ تھے اور عائشہ ہنس دی۔ خوشی سے ، محبت سے ، اس احساس سے کہ وہ اس کا تھا۔

" کیا تم مجھ سے شادی کرو گی عائشہ ؟ " وہ مسکرا کر بولا۔

" ہاں۔۔کروں گی۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرائی ۔ ہادی نے اس کے انگلی میں انگوٹھی پہنائی۔ عائشہ اس پر اتنا اعتبار کرتی تھی کہ بنا کچھ سوچے سمجھے اپنی پوری زندگی اس شخص کے نام کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہی تو تھا اس کے پاس جب کوئی نہیں تھا۔ اسی شخص نے تو اسے محبت کرنا سکھائی تھی۔

اسے یہ نہیں پتا تھا کہ کچی عمر کی محبتیں ، پکے روگ دیتی ہیں۔

" میرے دل پر ہمیشہ تمہاری حکمرانی رہے گی۔ یہ میر ہادی کا وعدہ ہے۔" اور وہ میر ہادی کی دی گئی زبان تھی۔ وہ اپنی کہی گئی باتوں پر عمل بھی کرتا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ پھر ان دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں ساحل کے قریب واک کرنے لگے ۔ ہاتھ ہاتھوں میں لیے وہ خوابوں کی دنیا بنا رہے تھے۔ اس بات سے انجان کہ خواب کو ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔

" عائشہ تم میرے لیے کیا کرسکتی ہو؟ " وہ طلب جواب تھا۔

" میں آپ کے لیے کسی کا قتل کر سکتی ہوں ہادی۔" وہ پیار سے بولی۔ ہادی ہنس دیا۔ ایک چیونٹی تو ماری نہیں جاتی تھی اس سے اور بات قتل کی کر رہی تھی۔ عائشہ نے اسے غصے سے دیکھا۔ تو وہ یک دم خاموش ہوا۔ ہنسی کنٹرول کی اور سنجیدگی سے بولا۔

" پتا ہے عائشہ محبت کیا ہے؟ " ہادی نے اس کی نیلی آنکھوں میں دیکھتے کہا۔

" کیا ؟ " وہ مسکرا کر بولی۔

" سمجھو تو احساس ، دیکھو تو رشتہ

چاہو تو زندگی ، کرو تو عبادت

کہو تو لفظ ، نبھاو تو وعدہ

مل جائے تو جنت ، ورنہ موت۔"

وہ اس کی نیلی آنکھوں میں ڈوبتے بولا۔

وہ اسے چھوڑنے رات کو گلی کے باہر آیا۔ عائشہ نے اسے منا بھی کیا تھا مگر وہ نہیں مانا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر عائشہ باہر نکلی۔ مگر اس کے قدم ساکت ہوئے جب اس نے اپنے ابا کو سامنے سے چل کر آتے دیکھا۔ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ آرہے تھے۔ ہادی نے غور نہیں کیا۔ مگر وہ صدیقی ہی تھے۔ انہوں نے عائشہ کو دیکھا تو فورا غصے سے اس جانب آئے۔

" یہ گل کھلانے بھیجتا ہوں تجھے؟؟؟ " انہوں نے غصے سے عائشہ کو گردن سے دبوچا۔ میر ہادی کو اپنا پارہ ہائی ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ گاڑی سے نکلا عائشہ کو ان کی گرفت سے چھڑایا اور ان کا گریبان تھام لیا۔

" چھوڑو مجھے ذلیل انسان۔۔" صدیقی غصے سے چیخے تھے۔

مگر اس سے پہلے کے وہ مزید کچھ کہتے گولی کی آواز نے محلے کی خاموشی کو چیرا۔ میر ہادی نے صدیقی کے پیٹ میں فائر کیا تھا۔ جب وہ پیچھے کو گرے تو ہادی نے ان پر دو اور فائر کیے۔ ان کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ وہ۔مر چکے تھے۔ عائشہ صدمے سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ اسے ہادی کے ہاتھ میں پسٹل دیکھ کر یہ اندازہ تو ہوگیا تھا کہ وہ اس پسٹل کو چلانے کا عادی تھا۔ اس نے مڑ کر ہادی کے منھ پر زور دار تھپڑ رسید کیا۔ اس عائشہ کو دیکھا جو اب اپنے باپ کی لاش کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بھلا لاشیں بھی جاگتی ہیں کیا؟ اس نے نا محرم سے محبت کی اتنی بڑی قیمت اٹھائی تھی۔ کہ ایک پل وہ یتیم کہلائی جانے لگی تھی۔ محلے لوگ باہر نکل کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہاجرہ بی گلی کے پار کھڑی یہ سارا منظر دیکھ چکی تھیں۔ حیرت اور خوف سے ان کی آنکھیں نم تھیں۔

" عائشہ میری بات۔۔" اس سے پہلے کے ہادی مزید کچھ کہتا عائشہ نے اٹھ کر ایک زور دار تھپڑ پھر سے مارا۔

" دفعہ ہو جاو یہاں سے !! چلے جاو میری زندگی سے میر ہادی !! وہ جیسا بھی تھا میرا باپ تھا۔ تمہیں کس نے حق دیا کہ تم اس کو ماروں۔ یہ میں یہ کہوں کہ تم قاتل ہی ہو!!

تم۔۔ تم سب کچھ ہو۔ کہہ دو کہ وہ افواہیں بھی سچ ہیں؟؟۔۔" وہ روتی روتی چیخ رہی تھی۔ سب نے اسے منا کیا تھا پر وہ کتنی پاگل تھی جو ایک سراب پر اعتبار کر بیٹھی۔

" ہاں سچ ہیں وہ افواہیں!! تو ؟؟ دیکھو میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ تمہیں بہت اچھی زندگی دے سکتا ہوں میں۔ چھوڑ دو ان سب کو ، چلو میرے ساتھ۔" اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے ساتھ لے کر جانا چاہا۔ مگر عائشہ نے اسے پرے جھٹکا۔

" دفعہ ہو جاو میری زندگی سے میر ہادی !! اور واپس لوٹ کر مت آنا۔ ورنہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے مار دوں گی۔" وہ چیخی اور اسے دور دھکا دیا۔

وہ ضبط کر کے مٹھیاں بھینچ گیا۔ یہ وہ واحد لڑکی تھی جس نے اسے تھپڑ مارا تھا۔ اور یہ واحد لڑکی تھی جسے وہ ہزار بار معاف کرسکتا تھا۔ وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس کا خیال تھا چند دن میں وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکی تھی۔

☆~~~~~~~~~☆

معمول کے مطابق ایک اذلان طارق ہال میں موجود تھا۔ جمعہ کے بعد تمام ہوسٹل میں رہنے والے طلبہ وہاں نشستوں پر بیٹھے تھے۔ اذلان سٹیج پر کھڑا تھا۔ اس نے گہرا سانس کیا اور بولنا شروع کیا۔

" اسلام و علیکم۔۔ آج میں جس موضوع پر بات کرنے جا رہا ہوں وہ موضوع بہت اہم ہے۔ " عورت کا موضوع۔"

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

عورت اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت، انسانیت کی معمار، نسلِ انسانی کی محافظ اور معاشرے کی روح ہے۔ وہ صرف ایک وجود نہیں بلکہ محبت، ایثار، صبر، قربانی، وفاداری اور رحمت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اگر ایک مرد معاشرے کی طاقت ہے تو عورت اس معاشرے کی بنیاد ہے۔ بنیاد کمزور ہو جائے تو مضبوط سے مضبوط عمارت بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اسلام سے پہلے دنیا کے بہت سے معاشروں میں عورت کو ذلت، ظلم اور محرومی کا سامنا تھا۔ کہیں اسے وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا تھا، کہیں اسے انسان سے کم سمجھا جاتا تھا، اور کہیں زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ مگر جب قرآن نازل ہوا تو

سب سے پہلے انسان کی عزت کو بحال کیا، عورت کو اس کا مقام دیا، اس کے حقوق مقرر کیے اور یہ اعلان کر دیا کہ عزت کا معیار جنس نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ

ترجمہ:

"اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں اس لیے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔"

(سورۃ الحجرات، 49:13)

یہ آیت پوری انسانیت کے لیے ایک اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔ نہ مرد اپنی جنس کی وجہ سے افضل ہے اور نہ عورت اپنی

جنس کی وجہ سے کمتر۔ اللہ کے نزدیک اصل فضیلت صرف تقویٰ، کردار اور نیک اعمال کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ○

ترجمہ:

"اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی۔"

(سورۃ الإسراء، 17:70)

یہ عزت صرف مرد کے لیے نہیں بلکہ ہر انسان کے لیے ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ لہٰذا کسی عورت کی بے عزتی کرنا دراصل اس عزت کی نفی ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود انسان کو عطا فرمائی۔ قرآن مجید عورت کو سکون، محبت اور رحمت کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ○

ترجمہ:

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔"

(سورۃ الروم، 30:21)

ذرا غور کیجیے، اللہ تعالیٰ نے ازدواجی زندگی کی بنیاد غلبہ، سختی یا برتری پر نہیں رکھی بلکہ محبت، رحمت اور سکون پر رکھی۔ جہاں محبت ختم ہو جائے، وہاں ظلم جنم لیتا ہے، اور جہاں احترام ختم ہو جائے، وہاں رشتے صرف نام کے رہ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایک دوسرے کا ساتھی اور مددگار قرار دیتے ہوئے فرمایا:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ○

ترجمہ:

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔"

(سورۃ التوبہ، 9:71)

یہ آیت اس تصور کی نفی کرتی ہے کہ عورت صرف تابع یا کم تر ہے۔ قرآن دونوں کو ایک دوسرے کا معاون، خیر خواہ اور ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیک اعمال کے اجر میں بھی مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ○

ترجمہ:

"جو کوئی نیک عمل کرے، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔"

(سورۃ النحل، 16:97)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نجات، کامیابی اور اجر کا معیار بھی جنس نہیں بلکہ ایمان اور عملِ صالح ہے۔ قرآن نے عورت کے معاشی حقوق بھی محفوظ کیے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ○

ترجمہ:

"مردوں کے لیے ان کی کمائی میں حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی میں حصہ ہے۔"

(سورۃ النساء، 4:32)

اسی طرح وراثت میں بھی عورت کا حق مقرر فرمایا:

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالأَقْرَبُونَ ○

ترجمہ:

"والدین اور قریبی رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے مال میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی حصہ ہے۔"

(سورۃ النساء، 4:7)

یہ اس دور میں نازل ہوا جب عورت کو جائیداد کا حق تک حاصل نہیں تھا۔ قرآن نے اس کے حق کو اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حق قرار دیا۔ قرآن نے مردوں کو حکم دیا:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ○

ترجمہ:

"اور ان (عورتوں) کے ساتھ اچھے طریقے سے زندگی بسر کرو۔"

(سورۃ النساء، 4:19)

"معروف" کا مطلب صرف کھانا، لباس یا رہائش فراہم کرنا نہیں، بلکہ نرم لہجہ، عزت، انصاف، حسنِ سلوک، اعتماد، صبر اور محبت بھی اسی میں شامل ہیں۔ یاد رکھو، عورت پر بلند کی جانے والی ہر آواز آسمان تک پہنچتی ہے، اس کی آنکھ سے نکلنے والا ہر آنسو اللہ دیکھتا ہے، اس کے دل پر لگنے والی ہر چوٹ اللہ جانتا ہے، اور اس کی خاموش آہیں بھی رب کے علم سے پوشیدہ نہیں۔ عورت کی عزت صرف اس وقت نہیں جب وہ تمہاری ماں ہو، ہر عورت احترام کی مستحق ہے کیونکہ اس کی عزت اللہ نے مقرر کی ہے۔ اگر تم کسی کی بیٹی کی عزت کرو گے تو کل کوئی تمہاری بیٹی کی عزت کرے گا۔ اگر تم کسی کی بہن کا احترام کرو گے تو تمہاری بہن بھی عزت پائے گی۔ معاشرے کی عزت عورت کے احترام سے وابستہ ہے۔ جو ہاتھ عورت کو سہارا دینے کے لیے اٹھتا ہے وہ بابرکت ہوتا ہے، اور جو ہاتھ ظلم کے لیے اٹھتا ہے وہ اپنے رب کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ جو زبان عورت کی

عزت کرتی ہے وہ اللہ کو محبوب ہے، اور جو زبان اسے رسوا کرتی ہے وہ اپنے ہی کردار کی گواہی دیتی ہے۔ دنیا کی کوئی تہذیب عورت کو وہ مقام نہیں دے سکتی جو قرآن نے اسے دیا ہے، کیونکہ قرآن نے اسے رحمت، عزت، حقوق، تحفظ اور وقار عطا کیا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم قرآن کو پڑھیں، سمجھیں اور اپنی زندگیوں میں نافذ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم ہر عورت کے ساتھ عدل، احترام، رحمت، حسنِ اخلاق اور پاکیزہ کردار کا معاملہ کریں، اس کے حقوق ادا کریں، اس کی عزت کی حفاظت کریں، اور اپنے گھروں، خاندانوں اور معاشرے کو قرآن کی تعلیمات کے مطابق امن، محبت اور احترام کا گہوارہ بنائیں۔

آمین یا رب العالمین۔

وہ سٹیج سے اتر رہا تھا اور طلبہ اسے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ وہ رشک کیے جانے کے قابل تھا۔

☆~~~~~~~~~☆

" عائشہ کچھ کھا لو۔ " ہاجرہ بی نے اس کے سامنے کھانے رکھتے کہا اور وہاں سے چلی گئیں۔ ابا کی وفات کو تین دن ہونے کو تھے۔ ہاجرہ بی تو بہت روئی تھیں۔ مگر وہ۔۔مگر وہ تو بس گہرے صدمے میں تھی۔

بس ابا نہیں گئے تھے۔ میر ہادی پر اس کا اعتبار بھی ایک ہی پل میں چکنا چور ہوا تھا۔ سارے خواب من و مٹی تلے ابا کے ساتھ ہی دفن ہوگئے تھے۔ میر ہادی کا وہ اطراف اس کی جان نکالنے کے لیے کافی تھا۔ ٹوٹا تو صرف اعتبار تھا، پھر روح کیوں جل رہی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی بار میر ہادی سے گھن آئی تھی۔ با خدا اسے زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے گھن آئی تھی۔ یہ کس وحشی سے محبت کر بیٹھی تھی وہ۔ یہ احساس تنا تکلیف دہ تھا کہ ایک ایسا شخص جس کی " افواہیں " سن کر کسی کی بھی روح کانپ جاتی تھی۔ وہ افواہیں نہیں تھیں، وہ تو حقیقت تھی۔ اس دل خول رہا تھا یہ سوچ کر اس نے کتنے ہی لوگوں کی اب تک جان لی ہو گی۔ اسے وحشت ہوئی خود سے جس نے اسے اپنے دل میں جگہ دی۔ وہ تو دل رکھتا ہی نہ تھا، پھر وہ اسے اپنا دل کیوں دے بیٹھی تھی۔ وہ قاتل تھا ، مجرم تھا، ایک ذلیل انسان تھا۔ وہ اس سے نفرت کیوں نہیں کر پا رہی تھی ۔ اسے گھن

آئی خود سے کہ وہ اس سے نفرت کیوں نہیں کر پا رہی تھی۔ روتے روتے کتنے لمحے گزرے اسے یاد نہیں تھا۔

باتھ روم میں آ کر منھ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ صحن میں آئی تو ہاجرہ بی کھوئی کھوئی سی آسمان کو تک رہیں تھی۔ پچھلے تین دن میں محلے کے لوگوں نے جتنی باتیں ہاجرہ بی کو سنائی تھی ، ان سب کی ذمہ دار تو وہ تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جو تب نہیں بولتے تھے جب ابا اس پر ہاتھ اٹھاتے تھے۔ ان لوگوں کی غیرت تب کیوں نہ جاگی تھی؟ اس کے کردار پر بات کرتے وقت سب کی غیرت جاگ گئی تھی۔ سب کو آخرت یاد آ گئی تھی۔اس نے اپنے ساتھ ہاجرہ بی کو کہیں نہیں چھوڑا تھا۔ اسے خود سے ایک دفعہ پھر گھن آئی۔ وہ روتے روتے ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"مجھے--مجھے معاف--کر دیں--پلیز--" وہ اونچی اونچی رو رہی تھی۔ مزید وہ کچھ نہ بولی ، ہاجرہ بی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سر پر ہلکا ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"اللہ کہتا ہے--جب انسان سے کوئی غلطی ہو تو اس کی توبہ کر لینی چاہیے۔ وہ بڑا قادر ہے۔ تجھے معاف کر دے گا۔ جا سچے دل سے توبہ کر لے۔ وہ تجھے بخش دے گا۔" انھوں نے اپنے آنسو صاف کرتے کہا۔ وہ فورا اٹھی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ وضو

کرتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کتنے ہی مہینوں بعد وہ آج نماز پڑھنے جا رہی تھی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ جب سے اس نے میر ہادی سے باتیں کرنا شروع کیا تھا وہ نمازیں پڑھنے بھول گئی تھی۔ ہادی کے اس کی زندگی میں آنے سے پہلے تو وہ پانچ وقت کی نماز ادا کرتی تھی۔

" گناہ آپ کی اچھائیوں کو کھا جاتے ہیں۔"

گناہ اس کی اچھائیوں کو بھی کھا گئے تھے۔ وہ تو رب کو منھ دکھانے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔ نماز بچھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔میر ہادی کی محبت تو بس ایک فریب تھی۔ وہ اللہ کو کیا منھ دکھاتی ؟ کیا اللہ اسے معاف کر دیتا ؟ کیا وہ معافی کے لائق تھی؟ نماز پڑھتے ہوئے اس کی آنکھیں نم تھیں۔ سجدہ زیر ہوتے اسے اپنے رب یاد تھا۔ وہ رب کو بھولی نہیں تھی ، بس گمراہ ہو گئی تھی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وہ رو رہی تھی۔ اونچی ہچکیوں سے روتے اسے یہ گمان کیوں نہ گزرا تھا کہ وہ رحیم تھا ۔ وہ رحم کرنے والا تھا۔ وہ کریم بھی تھا۔ وہ کرم کرنے والا تھا۔ وہ تو اپنے بندوں سے ستر ماوں سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ وہ کیوں نہ بخشتا اسے ؟

"یا اللہ۔۔۔مجھے معاف کر دے۔۔میرے گناہ بخش دے۔۔مجھے معاف کردے۔۔" وہ کتنی ہی دیر اونچی اونچی روتے بار بار یہ الفاظ ادا کرتی رہی۔ روتے روتے وہ سجدہ زیر ہوگئ۔ لب پر اب بھی یہی الفاظ تھے۔ روتے ہوئے کب وہ نیند کی وادیوں میں جا سوئی اسے علم تک نہ ہوا۔ ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل فون زور سے بج رہا تھا۔ فون کی اسکرین پر ہادی کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ بے سد سوتی رہی۔ اس نے میر ہادی سے اس دن کے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

" محبت کرنے والا مرد !

ایک سمجھدار عورت کو بھی بچی بنا دیتا ہے۔

اور ایک انا پرست مرد !

ایک بچی کو بھی سمجھدار عورت بنا دیتا ہے۔"

☆~~~~~~~~~☆

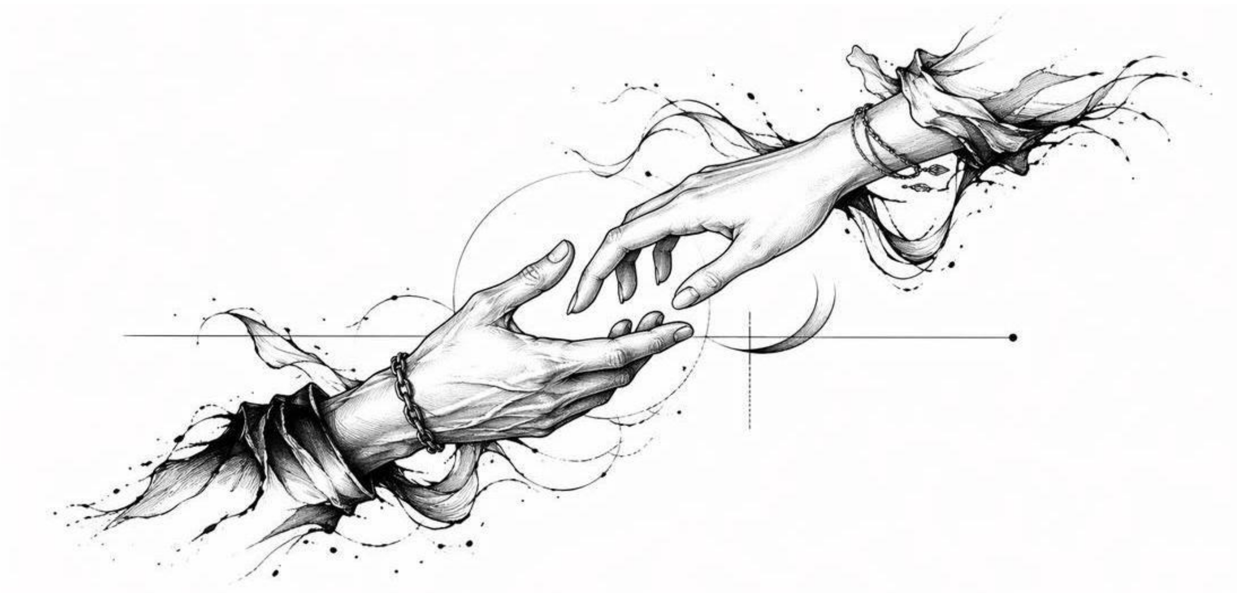

باب 5 :

~ محبتِ صادق ~

مجھے زندگی میں قدم قدم ،

تیری رضا کی تلاش ہے۔

تیرے عشق میں اے اللہ ،

مجھے انتہا کی تلاش ہے۔

میں گناہوں میں ڈوبا ہوا ہوں ،

میں زمین پہ ہوں گرا ہوا۔

جو مجھے ان گناہوں سے بری کرے ،

مجھے اس دعا کی تلاش ہے۔

میں نے جو کیا برا کیا ،

میں نے خود کو خود ہی تباہ کیا۔

جو تجھے پسند ہو اے اللہ ،

مجھے اس ادا کی تلاش ہے۔

چند ماہ بعد۔۔

بہرام ولید اپنے علاقے کے ایک مشہور ای ایس پی تھا۔ پچھلے چند سالوں سے وہ لاہور کے مختلف علاقوں میں اپنی ڈیوٹی کر چکا تھا۔ کراچی میں اس کی پوسٹنگ کو ابھی چند ہفتے ہی ہوئے تھے۔ وہ لاہور سے بیوی ایمان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ ان کی شادی کو دو ماہ ہو چکے تھے۔ عائشہ کے ساتھ جو واقع پیش آیا تھا اس کی خبر پورے کالج میں پھیل چکی تھی۔ ایمان کے والد نے جلد بازی میں اپنی بیٹی کی حفاظت کے لیے اس کا نکاح اس کے بچپن کے منگیتر بہرام ولید سے دو دن بعد ہی کر دیا تھا۔ بہرام کو لاہور سے اسپیشل فوری طور پر ایمان کے بابا نے اسے بلایا تھا۔ نکاح سادگی سے ہوا تھا۔ جبکہ ایک ہفتے کے بعد ان کی رخصتی کی تقریب بھی کر دی گئی تھی۔ ایمان کو اس کے بابا نے آگے پڑھنے سے روک دیا تھا۔ جبکہ اس کا نام بھی میرٹ لسٹ میں آیا تھا۔ بہرام ایمان سے پانچ سال بڑا تھا۔ وہ ملک کا وفادار پولیس اہلکار تھا۔ وہ بہرام ولید تھا۔ مجرم اس کے نام سے خوف کھاتے تھے۔ اے ایس پی بہرام ولید کو جس بھی علاقے میں پوسٹ کیا جاتا تھا وہاں سے وہ چند ہفتوں میں ہی مجرموں کا صفایا کر دیتا تھا۔ اسی لیے اتنی صرف چھبیس

سال کی عمر میں ہی وہ اے ایس پی تھا۔ کم بخت بڑی صفائی سے مجرموں کو مارتا تھا۔ عدالت کا انتظار نہیں کرتا تھا۔ عدالتی نظام کو تو وہ اچھے سے جانتا تھا۔ مجرم بہرام ولید کے سامنے ہو تو کہاں بچ سکتا ہے؟ اور اب بہرام ولید کو کراچی کے جس علاقے میں پوسٹ کیا گیا تھا وہ علاقہ زیادہ تر میر ہادی کے استعمال میں آتا تھا۔ بہرام ولید نے حیران اس وقت ہوا تو جب اس علاقے سے تلاش گمشدگی کی رپورٹس ہر دن دس فیصد بڑھ رہیں تھیں۔ وہ کہاں جاتے تھے ، ان کو آسمان کھا جاتا تھا یا زمین نگل جاتی تھی کسی کو کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

بہرام ولید نے عہد کیا تھا کہ وہ یہاں سے اغوا کے کیسز کو کم کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر جہاں سے اسے ایک سرا ملتا تھا، وہیں سے دوسرا شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ زیادہ تر اغوا کے طریقے ایک جیسے تھے۔ ایک وین جو لوگوں کو اٹھا رہی تھی پھر سی ٹی وی کے بغیر والے علاقوں میں غائب ہو جاتی تھی۔ نمبر پلیٹ سرے سے لگی ہی نہیں تھی۔ پہلے پہل بہرام کو یہی لگا تھا کہ یہ کوئی اغوا کار گینگ ہو سکتی ہے۔ مگر اگر وہ اغوا کرتے تھے تو پیسے کیوں نہیں مانگتے تھے؟ اور اگر ان کا مقصد آرگنز سمگل کرنا تھا تو لاشیں کہاں جاتی تھیں؟ آہستہ آہستہ ان کیسز کو حل کرتے ہوئے اسے یہ اندازہ تو ہو چکا تھا

کہ اس سب میں امیر عہدے دار کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ مگر کس کا؟؟ اس سے چند بعد بہرام کی نظر ایک لوکل نیوز پیپر پر پڑی جہاں میر ہادی کے خلاف " افواہیں " نام سے ایک لکھاری نے بہت کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کالم میں میر ہادی کے خلاف اٹھتی تمام افواہوں کو سچ قرار دیا گیا تھا۔ کالم کے آخر میں کسی کا نام درج نہیں تھا ۔ نہ ہی کوئی نمبر دیا گیا۔ مگر اسے پڑھ بہرام ولید کو یہ اندازہ تو گیا تھا کہ وہ جس نے بھی لکھا تھا وہ میر ہادی کے بہت قریب رہ چکا تھا یا شاید ابھی بھی تھا۔ سارے دن اپنے تھانے میں کام کرنے کے بعد بہرام رات کو تکا ہوا گھر آیا تھا۔

یہ گھر ایک چھوٹی سی سرکاری کالونی کا تھا۔ جو اسے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ہی دیا گیا تھا۔ جب اسے یہ گھر ملا تھا اسے یہی توقع تھی کہ اسے چھوٹا گھر دیا جائے گا۔ ظاہر تھا وہ رشوت تو لیتا نہیں تھا جو محل نما گھر بنا لیتا۔ ویسے بھی اس سے اوپر کے آفیسر بھی اسے زیادہ پسند اسی لیے نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کے رشوت کام کرتے جو نہیں تھا۔ سفید پوش آدمی کی یہی بات اچھی ہوتی ہے کہ وہ سفید ہوتا ہے ، دل سے بھی اور باہر سے بھی۔ اس کا دل سیاہ نہیں ہوتا۔ وہ پیسوں کے لیے سیاہ کام نہیں کرتا۔ وہ گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا تو لاونج مس سامنے ہی اسے ایمان صوفے پر ٹی وی دیکھتی نظر آئی ۔ بہرام

نے ہاتھ میں پکڑی فائل ٹیبل پر رکھی اور اس کے ساتھ بیٹھا۔ وہ اس کے آنے کا انتظار روز کرتی تھی۔ بھلے ہی یہ اریج میرج تھی پر پیار تو ان میں بے پناہ تھا۔ کزنز یو نو۔۔

بلیک شرٹ پر نیچے بلیک ہی پینٹ پہنے ، بال ماتھے پر بے پروا سے تھے۔ کلائی میں گھڑی پہنے ، سیاہ آنکھیں والا وہ ایک خوش شکل مرد تھا۔

" آ گئے آپ ؟ کھانا لگاؤں؟ میں نے بھی کچھ نہیں کھایا بہت بھوک لگ رہی ہے۔ " وہ فورا اٹھی اور کیچن کی جانب جانے لگی۔

" ارے بیگم۔۔ رک جاو کیوں ہر وقت گھوڑے پر سوار رہتی ہو؟ " بہرام نے مڑ کر ہنستے ہوئے اسے دیکھا۔ اس نے پہلے منہ بنایا پھر اس کے پاس واپس بیٹھ گئی۔

" تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔" وہ اٹھا میز سے وہ فائل لی اور ایمان کے سامنے کی۔

" اس میں کیا ہے ؟ " وہ فائل کھولتے ہوئے بولی پھر اگلے ہی پل خوشی سے اس چیخ نکل گئی۔ اس فائل میں ایمان کے میڈیکل یونیورسٹی میں داخلے کے کچھ Documents تھے۔ ایمان کی پڑھائی چھوٹی تھی ۔ وہ کہتی نہیں تھی مگر بہرام نے نوٹ کیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا آگے پڑھنے۔ پھر وہ سوچتا تھا ۔ بہرام ولید پر لعنت اگر وہ اپنی بیگم کی ایک چھوٹی سی خواہش نہ پوری کر سکے تو۔

" کیسا لگا سرپرائز ؟ " وہ مسکرا کر بولا۔ یا خدا وہ کتنا خوبصورت مسکراتا تھا۔

" بہت بہت اچھا۔۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرا کر بولی تو بہرام نے اس کے ماتھے پر اسے بوسا دیا۔ ایک تو یہ لڑکی بات بات پر ایموشنل ہو جاتی ہے۔

" تم تو روتے ہوئے بھی پیاری لگتی ہو ۔" وہ ہنس دیا۔

" بہرام !! میں اداس ہوں۔ مجھے ایسے تنگ نہ کریں۔" وہ چیڑ کر بولی آنسو صاف کر لیے۔

" کہیں تو دل حاضر ، جان حاضر ، یہ بندہ ناچیز حاضر۔" وہ سنجیدگی سے بولا تو ایمان مسکرا دی۔ اس کی یہ ادا کمال تھی ۔ روتے ہوئے کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مگر ایمان کیا جانتی تھی کہ اس یہ ادا تو بس اس تک ہی تھی۔ وہ اب مجرموں کو تو نہیں ہنستا ہوگا نہ۔۔۔ہونہہ۔

" بہرام آپ بھی نہ۔" اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپاتی وہ شاید بلش کر رہی تھی۔

" میں بھی نہ کیا بیگم ؟ اب آپ اپنے شوہر تھوڑا فلرٹ بھی نہیں کرنے دے سکتیں؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا اور وہ چھڑ رہی تھی۔ چاند نے دونوں کی جانب دیکھا ، ہواؤں میں پھولوں مہک بھرنے لگی۔ کیا حسین سما تھا محبوب سامنے ہو تو کیا حسین نہیں لگتا ؟

''آپ کو تو میری قدر ہی نہیں ہے بہرام۔ '' اس نے گلہ کیا۔ وہ اسے چھیڑ کیوں رہا تھا ؟

''آپ پر تو بہرام ولید اپنی چار زندگیاں بھی قربان کرسکتا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

بہرام ولید ایک نیک مرد اور اچھا شوہر تھا ۔ تو کیوں نہ دنیا اسے رشک سے دیکھتی؟ وہ اپنی عورتوں کا حاکم نہیں تھا ، محافظ تھا۔ تو کیوں نہ اس عورت کا نصیب سنورتا جو اس کے حق میں لکھی گئی تھی۔

اسلام نے مرد کو صرف گھر کا سربراہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک ذمہ دار، عادل، رحم دل اور امانت دار محافظ بنایا ہے۔ ایک نیک مرد وہ نہیں جو صرف لوگوں کے سامنے دیندار نظر آئے، بلکہ وہ ہے جو اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ بھی وہی اخلاق اختیار کرے جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ ماں ہو، بیوی ہو، بیٹی ہو یا بہن، ہر عورت اللہ کی امانت ہے، اور اس کی عزت، حفاظت اور حقوق کی ادائیگی مرد کی ذمہ داری ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ○

''اور ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔''

(سورۃ النساء، 4:19)

یہ مختصر مگر عظیم حکم ہر مسلمان مرد کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ "معروف" کا مطلب صرف اچھا کھانا یا لباس دینا نہیں، بلکہ عزت دینا، نرمی سے گفتگو کرنا، ان کے جذبات کا احترام کرنا، ان کے حقوق ادا کرنا، ان کی غلطیوں پر صبر کرنا اور ان کے وقار کی حفاظت کرنا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے تعلق کو محض ایک معاشرتی معاہدہ نہیں بلکہ سکون، محبت اور رحمت کا رشتہ قرار دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ○

ترجمہ :

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔" (سورۃ الروم، 30:21)

غور کیجیے، اللہ تعالیٰ نے اس رشتے کی بنیاد محبت، رحمت اور سکون کو بنایا ہے، نہ کہ غرور، ظلم، سختی یا تحقیر کو۔ جو مرد اپنی بیوی کو عزت دیتا ہے، اس کی رائے سنتا ہے، اس کی

عزتِ نفس کا خیال رکھتا ہے اور اس کے دل کو سکون دیتا ہے، وہ دراصل اس آیت پر عمل کر رہا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو عدل اور انصاف کا بھی حکم دیا:

إِنَّ اللہَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ ○

"بے شک اللہ انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے۔"

(سورۃ النحل، 16:90)

احسان کا مطلب یہ ہے کہ انسان صرف فرض ادا نہ کرے بلکہ محبت، نرمی، درگزر اور بہترین اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ یہی وہ کردار ہے جو ایک نیک مرد کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ○

"اور عورتوں کے لیے بھی ویسے ہی معروف حقوق ہیں جیسے ان پر ذمہ داریاں ہیں۔"

(سورۃ البقرہ، 2:228)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اسلام نے عورت کو حقوق سے محروم نہیں کیا بلکہ اس کے حقوق کو تسلیم کیا اور مرد کو ان کی ادائیگی کا ذمہ دار بنایا۔ ایک نیک مرد کبھی اپنی طاقت، آواز یا اختیار کا استعمال عورت کو نیچا دکھانے کے لیے نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ عزت دینا مردانگی کی کمزوری نہیں بلکہ ایمان کی مضبوطی ہے۔ وہ اپنی ماں کی خدمت کو سعادت سمجھتا ہے، اپنی بہن کی عزت کو اپنی عزت سمجھتا ہے، اپنی بیٹی کو اللہ کی رحمت سمجھتا ہے اور اپنی بیوی کو زندگی کا ساتھی اور اللہ کی امانت سمجھ کر اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔"

(جامع الترمذی)

یہی وہ معیار ہے جس پر ایک مسلمان مرد کی عظمت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ جو اپنی عورتوں کو عزت دیتا ہے، ان کے حقوق ادا کرتا ہے، ان کے آنسوؤں کی قدر کرتا ہے، ان کے دل کو تکلیف پہنچانے سے بچتا ہے اور ان کے لیے رحمت کا سبب بنتا ہے، وہ اللہ کے

نزدیک بھی محبوب بننے کی امید رکھتا ہے۔ عورت کی عزت کرنا صرف ایک سماجی خوبی نہیں بلکہ عبادت ہے، کیونکہ یہ اللہ کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی ہے۔ جو مرد اپنی عورتوں کی عزت کرتا ہے، اللہ اس کے گھر میں محبت، سکون، رحمت اور برکت عطا فرماتا ہے، اور یہی ایک حقیقی مومن اور نیک مرد کی پہچان ہے۔

☆~~~~~~~~~☆

اسلام آباد کا چاند پورے جوش سے ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ وہی ایک گھر کی اوپری منزل پر عائشہ بیٹھی قرآن کی تلاوت کر رہی تھی۔ روشن چہرہ ، نیلی آنکھیں ہلکی لال تھیں ، بالوں کے اوپر دوپٹا اوڑھے وہ پوری دلجمی سے قرآن پڑھ رہی تھی۔ چند ماہ قبل عائشہ کے والد کی وفات کے چند دن بعد ہی اس نے ہاجرہ بی سے درخواست کی تھی کہ وہ اسلام آباد کی یونیورسٹی میں ایم بی بی ایس کرنا چاہتی تھی۔ ہاجرہ بی نے مزید نہ کچھ سنا ، نہ دیکھا۔ وہ گھر ایک قریبی کی مدد سے بیچ کر انہی پیسوں سے ہاجرہ بی نے اسلام آباد میں گھر لے لیا تھا۔ عائشہ کی سکولر شیپ تھی سو اخراجات میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی۔ جانے سے پہلے ہادی کا قصہ وہ ختم کرنا چاہتی تھی سو سم توڑ کر پھینک دی۔ اسلام آباد کی ایک یونیورسٹی میں اس نے ایڈمیشن کنفرم کروا لیا تھا۔ ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے اندر ہی بنے کیمپ میں

وہ کبھی کبھی پارٹ ٹائم کر لیتی تھی۔ ابا کی پینشن دکان کا کرایا مہینے بعد ان کے محلے کے ہی ایک جاننے والے بھیج دیتے تھے۔ سو گزر بسر اچھا تھا۔ عائشہ نے اپنا پورا دھیان پڑھائی کی طرف لگا دیا تھا۔ دوست نہ ہونے کے برابر تھے۔ البتہ یونیورسٹی کے پیپرز میں ٹاپ کرنے کی وجہ سے کافی سٹوڈنٹس اسے جاننے لگے تھے۔ وہ کافی سٹوڈنٹس کی پڑھائی میں ہیلپ بھی کر دیتی تھی۔ اس کے ایم بی ایس کا ہاف ہونے والا تھا۔ میڈز کے پیپر تقریبا ختم ہونے کے قریب تھے۔ ایک آخری پیپر تھا جو کل تھا۔

یادیں جلدی م

بھلائی نہیں جاتیں ، تو محبتیں کیسے بھلائی جا سکتی ہیں۔ اسے آج بھی میر ہادی یاد آتا تھا۔ وہ انٹرنیٹ سے اس کی میڈیا سے گفتگو نکال کر سن لیتی تھی۔ وہ اسے بھولنا چاہتی تھی۔ اسے نفرت تھی میر ہادی کے نام سے جب سے اس حقیقت پتا چلی تھی دل میں بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے وہ آج بھی یاد آتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جب یاد اتا تھا تو وہ نفرت سے اس کا خیال جھٹک دیتی تھی۔ کبھی کھبار رو بھی لیا کرتی تھی ۔ ہاجرہ بی اس کی فکر میں آدھی ہو گئیں تھیں۔ وہ چاہتی تھی کوئی اچھا رشتہ آئے اور وہ اس کی شادی کر دیں۔ پڑھائی تو شادی کے بعد بھی ہو جائے گی۔ مگر وہ سنتی کب تھی؟

قرآن پڑھ کر اس نے سائڈ پر رکھا اور ٹی وی آن کیا۔ میر ہادی پریس کانفرنس کر رہا تھا۔ وہ نفرت سے سکرین کو دیکھے گئ۔ دل میں یوں خیال ابھرا کیا وہ بھی اسے یاد کرتا ہوگا ؟ وہ اسے بنا بتائے اس سے اتنی دور آ گئ تھی۔ وہ اسے یاد کرتا ہو گا یا اب بھی معصوم لوگوں کی جان لیتا ہو گا۔ دل نے آہ بھری۔ اس نے ٹیبل پر پڑے کاغذ اور قلم کو دیکھا۔۔اس نے میر ہادی کے بارے میں ہر حقیقت ایک لوکل نیوز پیپر میں شپوا دی تھی۔ نام پتا کچھ نہ دیا۔ سکرین پر اس کا چہرہ دیکھا تو نفرت پھر سے ہونے لگی۔ دل نے سوچا۔۔۔

تم وہ انسان ہو جس کے بعد کوئی بھی شخص میرے لیے قبل قبول نہیں رہا۔

تمہارے بعد وہ تعلقات بھی نہیں نبھائے جا رہے جو مجھ ہر لازم ہیں۔

تم اس قدر اعتبار توڑ گئے ہو کہ اب ڈر سا لگ گیا ہے۔

اب زندگی کو جینے کا دل نہیں چاہ رہا ، اب تو بس زندگی گزار رہی ہوں۔

ہر چاہت ، ہر خواہش دم توڑ گئ ہے۔

مختصر یہ ہے دل مر گیا ہے۔ (تم وہ شوق بھی کھا گئے جو مجھ میں کہیں باقی تھے۔)

تم ہر وہ آس توڑ گئے ہو جو کہیں نہ کہیں باقی تھی۔

تم تو جی رہے ہو مگر میرا دل مار گئے ہو۔

کل اس کا پیپر تھا، اس نے ٹی وی بند کیا اور پڑھنے بیٹھ گئی۔ اس کے خیال کو ذہن سے جھٹکا۔

☆~~~~~~~~~~☆

صبح آٹھ بجے کا وقت تھا۔ پیپر ہال میں پیپر کرتے ہوئے عائشہ کے ہاتھ تیزی سے لکھنے میں مصروف تھے۔ اس نے پیپر کرتے ساتھ پروفیسر کو تھاما دیا اور باہر نکل آئی۔ پیپرز کا آخری دن تھا۔ کیمپس میں کچھ ہی سٹوڈنٹس تھے۔ آگے چھٹیاں تھیں، اس نے لائبریری سے کچھ کتابیں لی تھیں۔ سو وہ لائبریری میں چلی گئی۔ وہ کتابیں دیکھ کر کھو جایا کرتی تھی۔ کتابیں اس کی محفوظ پناہ گاہوں میں سے ایک تھیں۔ دو گھنٹے بعد جب وہ لائبریری سے نکلی تو کیمس آل موسٹ خالی ہو چکا تھا۔ وہ باہر نکل رہی تھی جب اسے اپنے ایک پروفیسر طارق گہرے سانس لیتے نظر آئے۔ عائشہ وہ فورا ان تک آئی۔ انہیں سانس لینے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ان کو کرسی پر بیٹھتی وہ گر گئے تھے۔ اگر عائشہ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ضرور گھبرا جاتا۔ مگر عائشہ نہ گھبرائی اور نہ ہی پینک کیا۔

اس نے فورا ان کو سی پی آر دینا شروع کر دیا۔ چند ماہ کی میڈیکل پڑھائی میں وہ اتنا تو سیکھ ہی گئ تھی کہ کسی کو سی پی آر کیسے دیا جاتا ہے۔

" عباس انکل !!! " اس نے چیخ کر پکارا ۔ عباس کیمپس کے گاڈر تھے۔ عائشہ کی آواز پر بھاگے بھاگے اندر آئے۔ وہ مسلسل ان کا سی پی آر کرتی رہی ، جب سانس کچھ بحال ہوا تو وہ فورا انہیں کیمپس کے پاس بنائے گئے میڈیکل روم میں لے گئ۔ وہاں اج کل سینیر سٹوڈنٹس کی پریکٹس چل رہی تھی۔ مگر یونیورسٹی کے اندر بنا ہاسٹل دور تھا۔ سو وہ عباس کے ساتھ پروفیسر طارق کو میڈیکل روم میں ہی لے گئ۔

اندر داخل ہوتے اس نے ان کو سنگل پیشنٹ بیڈ پر لٹیا۔ وہاں دو سنیر کام کر رہے تھے۔ میسم نامی سنیر اب پروفیسر طارق کو چیک کر رہا تھا۔ شہد رنگ آنکھیں چند ثانیوں کو نیلی آنکھوں سے ٹکرائی۔ دنیا تھم گئ۔ نیلی آنکھوں نے فورا دوسری جانب دیکھا۔ شہد رنگ آنکھیں ساکت تھیں۔ یوں جیسے ہر برا خواب حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے کھڑا ہو۔ اس شخص نے فورا آنکھیں جھکا لیں۔ وہ نا محرم لڑکیوں کے سامنے آنکھیں جھکا لیا کرتا تھا۔

" وہ اذلان مصطفی تھا ، جو آج پہلی بار عائشہ صدیقی سے مل رہا تھا۔"

عائشہ نے نظریں اٹھا کر اسے پھر سے دیکھا۔ سفید شلوار قمیض پر ڈاکٹر کاٹ پہنے ، نظریں پروفیسر طارق پر جمائے وہ ان کا علاج کر رہا تھا۔ آنکھوں میں حیا ، چہرے پر نور ہی نور تھا۔ چند لمحے کوئی اسے دیکھتا تو نسلی مسلمان مرد کا گمان ہوتا تھا۔ عائشہ نے اتنا پر نور چہرہ آج سے پہلے کسی مفتی کا بھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ نجانے اللہ کو اس کی کون سی صفت محبوب تھی۔ عائشہ نے بھی نظریں جھکا دیں۔ سیاہ چادر سر پر درست کی۔ پروفیسر طارق کو مائینر اٹیک آیا تھا۔ صحیح وقت سی پی آر ملنے کی وجہ سے اٹیک نے کوئی نقصان نہیں کیا تھا۔ البتہ کمزوری ہو گئ تھی۔ عائشہ اس شخص کے چہرے پر پروفیسر طارق کے لیے پریشانی واضح دیکھ سکتی تھی۔ کافی مرتبہ عائشہ نے یونیورسٹی میں پروفیسر طارق اور اسے ایک ساتھ دیکھا تھا۔

" میں عائشہ ہوں۔ " اس نے تعارف کروایا۔

" میں اذلان ہوں۔ آپ کا شکریہ وقت پر سی پی آر دینے کے لیے ، میں اس سب کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ " نظریں جھکائے ہاتھ کمر پر پیچھے کی جانب باندھے وہ احترام سے بولا۔ وہ دونوں کیا جانتے تھے کہ یہ ایک تعارف ان کی زندگی بدلنے والا تھا۔ اسلام آباد کی ہواؤں نے تقدیر کو سلام کیا۔ جس نے دو بہترین لوگوں ملایا تھا۔

"مجھے چلنا چاہیے۔ آپ سر کا خیال رکھیے گا۔" وہ بولتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ اذلان نے سر کو خم دیا۔ پھر ایک نظر پروفیسر طارق کو دیکھا۔ جو ادویات کے زیر اثر سو رہے تھے۔ وہ اب ان کے پاس بیٹھ گیا۔ نیند آج اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جن آنکھوں کو محض وہ میں دیکھا کرتا تھا وہ آنکھیں روبرو لا کھڑی کر دی گئیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا اور آیات پڑھنے لگا۔ ہاں اسے آیات زبانی یاد تھیں۔ وہ حافظ قرآن تھا اور یہ اس کے لیے اعزاز کی بات تھی کہ اللہ نے اپنے عظیم کلام کو یاد کرنے کے لیے اسے بھی کئی اور لوگوں کی طرح چنا تھا۔

وہ تب تک دل کے مقام پر ہاتھ رکھتے آیات پڑھتا رہا جب تک اس کا دل نارمل نہیں ہوا۔ میسم پاس بیٹھے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ رشک تو اسے بھی اذلان مصطفی پر آیا تھا۔ وہ یقینا جس بھی عورت کی زندگی میں جاتا اس کی زندگی خوشیوں سے بھر دیتا۔

"یہ لو پانی پیو۔۔" میسم نے اذلان کی آنکھوں میں خوف محسوس کیا تھا۔ وہی خوف جو اس کی آنکھوں میں تب نمودار ہوتا تھا جب وہ اپنے خواب کے بارے میں میسم کو بتایا کرتا تھا۔

"ہمم۔۔" اس نے پانی کا گلاس لیا اور ایک دم سے سارا پی لیا۔

" اب یہ اجڑے باغ جیسی شکل مت بناو-- ہو جائیں گے سر ٹھیک-" میسم نے اسے ہنسانے کی ناکام کوشش کی- اذلان خاموش ہی رہا- کتنی ہی دیر وہ کے پاس بیٹھا رہا ، گہری سوچ میں ڈوبا رہا- 4 بجے کے قریب وہ ہوش میں آئے تھے-انہوں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو اذلان نے فورا ان کو بیٹھنے میں مدد دی- میسم پاس صوفے پر سو رہا تھا- جب کہ اذلان کی آنکھیں ساری رات جگانے کی وجہ سے ہلکی لال ہونے لگی تھیں - اس نے پروفیسر طارق کو پانی پلایا اور اس کے بعد ان کا ہاتھ تھام کر وہیں بیٹھ گیا-

" اب بہتر محسوس کر رہے ہیں آپ؟ " اذلان نے نرمی سے ان کا چومتے کہا-

" ٹھیک ہوں برخوردار کیوں ہلکان کر رہے ہو خود کو؟ " وہ نرمی سے اس کی جانب دیکھتے بولے-

" ارے ایسی تو کوئی بات نہیں ہے- بس آپ کی فکر ہو رہی تھی-" وہ ہلکا سا مسکرا کر بولا-

" بہت شکریہ بیٹا - " وہ بولے تو اذلان نے ان کی جانب دیکھا ، اسے تکلیف ہوئی-

" بیٹا بھی کہتے ہیں اور شکریہ بھی ؟ یہ ظلم نہ کرے -" وہ نم آنکھوں سے مسکرایا تھا- اسے عزیز تھا وہ باپ جو اس کو اس کے استاد کی صورت میں ملا تھا-

"پتہ ہے اذلان جب میری شادی کے چند سالوں میں اولاد نہیں ہوئی تھی نہ میری بیوی بہت روتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اللہ ہمیں اس نعمت سے محروم ہی رکھے گا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتی تو میں اسے بتاتا کہ دیکھو۔۔یہ ہے ہماری اولاد اذلان مصطفی۔ اللہ نے ہمیں محروم نہیں رکھا بلکہ ایک فرشتے صفت بیٹے سے نوازا ہے۔" وہ نم آنکھیں لیے کیا بول رہے تھے۔ اذلان دل کا بھر آیا۔ اس نے انہیں گلے سے لگایا۔

بعض دفعہ جو محبت آپ کو اپنے گھر سے نہیں ملتی ، اس محبت کا خانہ غیر پورے کر دیتے ہے۔ وہ غیر۔۔جو غیر لگتے ہی نہیں۔

☆~~~~~~~~~☆

کراچی کے محل نما مکان کا رخ کیا جائے تو ہادی اپنے کمرے میں ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ سفید شرٹ جس کے چند اوپری بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں شراب کا گلاس پکڑے وہ اپنے سامنے لگے شیشے میں خود کو تک رہا تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ نفرت تھی۔ اس لڑکی کے لیے نفرت جو اس سے بے وفائی کر کے اسے چھوڑ گئی تھی۔ بے وفائی ؟ کیا سچ میں ؟ منظر کو چند ماہ پیچھے لے کر چلے تو ہادی اس واقعے بعد چند دن عائشہ سے دور رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اس تک واپس آ جائے گی۔ محبت تھی اسے میر ہادی سے وہ اسے

نہیں چھوڑے گی۔ میر ہادی کیا جانتا تھا وہ جو توڑ کر آیا تھا وہ صرف دل نہیں تھا، وہ اس کا اعتبار تھا جسے اس نے بڑی بے رحمی سے توڑ دیا تھا۔ کافی دن وہ اسے فون کرتا مگر اس کا نمبر بند تھا۔ ایک ہفتے بعد ہادی اس کے محلے آیا تھا۔ اس کے گارڈز نے ہر جگہ پوچھا مگر صرف اتنا ہی جانا کہ وہ گھر بیچ کر جا چکے تھے۔ ہادی کو اپنے گھٹتا محسوس ہوا تھا۔ وہ اسے کیسے چھوڑ سکتی تھی؟ یہ احساس ہی جان لیوا تھا کہ وہ اسے چھوڑ گئی تھی۔

رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ وہ شدید غصے میں گاڑی ڈرائیور کر رہا تھا۔ اس کی گاڑی کا رخ کلیفٹن کی جانب تھا۔ اسے اپنا غصہ اتارنے کے لیے کوئی اور جگہ نہیں ملی۔ غصے سے آنکھیں لال ہونے لگیں۔ آنکھیں تو نم بھی ہوئیں تھیں مگر اسے کہاں پروا تھی؟ اسے آج احساس ہوا تھا کہ اتنی تکلیف تو اسے تب بھی نہیں ہوئی تھی جب اس نے اپنے باپ کو مارا تھا۔ پھر دل کے ٹوٹنے پر اتنی تکلیف کیوں ہو رہی تھی؟ اسے لگ رہا تھا وہ اس کے ساتھ بے وفائی کر گئی تھی۔ اسے عائشہ صدیقی سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ سامنے ہوتی تو وہ اس کو مار دیتا۔ بے وفائی کی سزا تو موت ہی تھی نہ؟ کیا واقعی وہ اسے مار سکتا تھا؟

ایک پل لگا تھا غصہ ، تپش اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ پوری دنیا کو آگ لگا دے۔ گاڑی روڈ پر پارک کرتے وہ گھنے درختوں کے بیچ میں سے چلتا ہوا بیسمینٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں لوگوں کا جانا حکومت نے ممنوع کر رکھا تھا۔ حکومت تو وہ خود تھا۔ آہ ! سسٹم کو اندر سے کھانے والے لوگ۔ بیسمینٹ اندر کا منظر کچھ مختلف نہ تھا۔ ہر طرف موت کا سماں تھا۔ لال بتیاں پوری بیسمینٹ میں روشن تھیں۔ ایک لمبی گزرنے کی جگہ تھی جس کے دونوں اطراف میں چھوٹے چھوٹے کمرے قطار در قطار بنے تھے۔ ان چھوٹے کمروں میں لوگوں کو اغوا کر کے لایا جاتا تھا۔ وہ چلتا ہوا آگے آرہا تھا۔ لال روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی ۔ منظر مزید خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چلتا ہوا آگے آیا اور قطار کے آخر میں بنے مین روم کے اندر داخل ہوا ۔ یہ روم وہ جگہ تھی جہاں ان لوگوں کے آرگنز نکالے جاتے تھے۔ وہ اندر داخل ہوا تو سامنے ہی سٹریچر پر ایک آدمی باندھا تھا۔ ڈاکٹر مستقیم اس کے پاس کھڑا ٹیبل سے اوزار پکڑ کر انہیں تیز کر رہا تھا۔ ہادی کو اندر آتا دیکھ کر وہ ایک جانب کھڑا ہوگیا۔

ہادی نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ اس کمرے میں سفید لب کی روشنی تھی البتہ خون کی کافی چھینٹے کمرے میں جگہ جگہ موجود تھی۔ کمرے کے ایک جانب چھوٹے چھوٹے

گولنگ فریج کے کئی ڈبے پڑے تھے۔ شاید آرگنز نکال کر ان کو اسی میں رکھا جاتا تھا۔ ہادی نے کمرے کے کونے سے ایک لوہے کی زنجیر پکڑی تھی۔ اپنے ہاتھوں میں زنجیر تھامے وہ سٹریچر پر بندھے اس وجود کی جانب آیا۔ آدمی بے ہوش تھا کچھ دیکھ نہ سکا۔ ہادی نے پہلا ضرب پوری قوت سے اس کے سینے میں لگائی۔ بے ہوش آدمی ادویات کے باوجود ہوش میں آیا اور درد سے تڑپ اٹھا۔ زنجیر کے ایک جانب لوئے کا بڑا سا ہک بنا تھا۔ موٹا آگے کی جانب سے نوکیلا۔ دوسرا ضرب لگنے پر وہ چیخ اٹھا۔ اس کے منہ پر بندھا کپڑا اس کی آوازوں کو بہت کم روک رہا تھا۔ بیسمینٹ ساونڈ پروف تھی تو آواز باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میر ہادی کتنی ہی دیر اسے مارتا رہا۔ آدمی کے جسم سے مختلف جگہوں سے خون رسنے لگا۔ میر ہادی کے ذہن کی سکرین پر نیلی آنکھیں رنگ بھرنے لگیں تو اس نے نفرت سے زنجیر کا ہک آدمی کے پیٹ میں گاڑھ دیا۔ سامنے پڑا وجود بے جان ہو چکا تھا۔ ان نیلی آنکھوں نے ہی میر ہادی کو اس سے محبت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ نیلی آنکھیں ہی اسے اب عائشہ صدیقی سے نفرت کرنے پر مجبور کر رہیں تھیں۔ میر ہاسی نے کسی ظالم بادشاہ کی طرح اس آدمی کی جان لی تھی۔

"وہ رات موت کی رات تھی۔"

نیلی آنکھوں نے پھر سے ذہن پر قبضہ کیا تو میر ہادی کا غصہ آپے سے باہر ہوا۔ وہ تپش کے عالم میں مین روم سے باہر آیا۔ قطار میں بنے پہلے کمرے کو کھولنا چاہا مگر وہ لاکڈ تھا۔ اس نے گرج دار آواز میں گارڈ کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ گارڈ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول رہا۔ اس کے مقابل کھڑے میر ہادی کا حلیہ دیکھا جائے تو سفید شرٹ پر خون کے کئی نشانات تھے۔ سیاہ پینٹ پر بھی کافی جگہ خون لگ گیا تھا۔ سیاہ رنگ پر خون زیادہ نمایاں نہیں تھا۔ مگر کیا وہ کافی تھا میر ہادی کے گناہ چھپانے کے لیے؟ گارڈ ہادی کی حالت دیکھ کر خود اس سے خوف کھا رہا تھا۔ ہاتھ میں لوہے کی زنجیر ابھی تک تھام رکھی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تو اندر ایک 24 سالہ مرد بندھا نظر آیا۔ ہادی کی حالت دیکھ کر وہ سہم کر کمرے کے ایک کونے میں ہوا۔ غصے کی انتہا تھی یا وحشت جو بھی آج موت کی رات تھی۔ ہادی نے اس مرد کو ایک کے بعد ایک زنجیر کا ہک مارا۔ یہاں تک کہ سامنے بندھا وجود تڑپ کر اپنی جان کھو بیٹھا۔ ہادی کی وحشت کی انتہا وقت ہوئی جب اس نے وہ زنجیر اس کے منہ ڈال کر باقی چند بچی سانسیں بھی چھین لیں۔ اس بیسمینٹ کے ایک چھوٹے کمرے میں آج پھر کوئی زندگی ایک ظالم کے ہاتھوں گواہ چکا تھا۔

اس دن کے بعد میر ہادی نے عائشہ کو کراچی کی ہر یونیورسٹی، ہر کالج ہر کالونی میں تلاش کروایا تھا۔ مگر اسے وہ نہیں ملی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ شہر چھوڑ کر کہیں جا سکتی تھی۔

زنجیر کی گونج سناتا ہے فسانہ

ظلمت کی چھاؤں میں جلتا ہے اک پروانہ

ظالم کے ہاتھوں میں ہے انصاف کا ترازو

عدل کی دہلیز پہ ہم کو خون ہے بچانہ

چپ کی زنجیروں میں قید ہے آوازیں

سچ کہنے والوں پہ ، ہوتا ہے فسانہ

ظلم کی راتیں تو کٹ ہی جائیں گی اک دن

سورج نکلے گا ، ہوگا نیا زمانہ

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ غَافِلاً عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ○ اِنَّمَا یُؤَخِّرُہُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْہِ الْاَبْصَارُ ○

سورة ابراہیم (14:42)

ترجمہ:

"اور تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ ظالموں کے اعمال سے غافل ہے۔ وہ تو انہیں صرف اس دن تک مہلت دے رہا ہے جس دن آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔"

☆~~~~~~~~~☆

شام کا وقت تھا عائشہ ہاجرہ بی کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ جب سے ابا گئے تھے ان دونوں کا کھانا خاموشی سے گزرتا تھا۔ ابا تھے تو ڈانٹ لیا کرتے تھے، مار بھی لیتے تھے۔ مگر ان کا مارنا کبھی اتنا تکلیف دہ نہیں لگا تھا جتنا ان کے بغیر رہنا برا لگ رہا تھا۔

" چھٹیاں ہو گئی ہیں۔۔میں چاہ رہی تھی سٹی ہاسپٹل میں اتنے دن جاب کر لوں۔ نرس کی جاب ہے یونیورسٹی ریفر بھی کر رہی ہے۔ اچھی تنخواہ بھی دے گے۔ کر لوں۔۔؟" اس نے سوالیہ نظروں سے ہاجرہ بی کو دیکھا۔

" مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو جب کرنی اپنی مرضی ہے ؟" ان کے لہجے میں سختی کے ساتھ نرمی بھی تھی۔

"آپ کہیں گی تو نہیں کروں گی۔" عائشہ نے نرمی سے کہا۔

" جو میں نے کہا ہے وہ تو کرتی نہیں ہو تم۔" وہ منھ بنا کر بولیں۔

" می می (Mimi) میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ " وہ اداسی سے بولی۔

"آسیہ کا نواسہ بہت اچھا ہے۔ تم مل کے دیکھو۔ میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔ بہت پیارا ہے اور تمہاری ہی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ " ہاجرہ بی اسے رشتے کی تفصیل بتانے لگیں۔

" لیکن میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ " وہ منھ پھیر کر بولی۔ ان کو کیسے بتاتی ہادی کی محبت دل سے نہیں جاتی۔

" اچھی طرح جانتی ہوں میں۔ نکال دو اس قاتل کو اپنے دل سے وہ تمہاری محبت کے لائق نہیں ہے عائشہ۔ ایک دفعہ تم نے اپنی مان کے دیکھ لی۔ تم نے بہت خسارے اٹھائے۔ اب ایک بار میری مان کر دیکھ لو۔" وہ اسے سمجھا رہیں تھیں۔ عائشہ ان کے لیے ان کی بیٹی جیسی تھی۔ عائشہ بھی انہیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سر ہلا دیا۔ مگر دل کو کون سمجھائے؟ عائشہ کو فرق نہیں پڑتا تھا کہ آسیہ کا گھر چھوٹا تھا یا ان کا نواسا کم کماتا تھا۔ اسے کبھی دولت کی طلب رہی ہی نہیں تھی۔ وہ تو بچپن سے پیار کو ترسی تھی۔ کیا

وہ پیار کی حقدار کی تھی؟ غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتیں ہیں اور ان غلطیوں کو درست بھی انسان کو ہی کرنا ہوتا تھا۔ اسے بھی اپنی غلطیاں درست کرنی تھیں۔

" محبت کبھی غلط نہیں ہوتی ، لوگ غلط نکل آتے ہیں۔"

" ٹھیک ہے۔۔آپ اتوار کو بلا لیں انہیں۔" عائشہ نے ہاجرہ بی سے کہا تو وہ ہاجرہ بی نے اسے گلے سے لگا لیا۔

" چار دن بعد؟ ٹھیک ہے۔ یعنی آج بدھ ہے تو۔۔ ہاں اوکے اوکے سارے انتظام دیکھ لوں گی میں۔" ہاجرہ بی نے اس کے ماتھے پر بوسا دیتے کہا۔

دور اسلام آباد کی ہواؤں نے خوشی سے چند لمحے اس لڑکی کو دیکھا اور ہولے سے سرگوشی کی۔

" ابرِ رحمت بن کر برسے گی۔

ہم پر اپنے محرم کی محبت ،

دنیا کی ہر شے کہے گی۔

رب کا انتخاب مبارک ہو۔"

اسلام آباد کے دوسری جانب اگر یونیورسٹی کا رخ کرے تو ہاسٹل کے باہر اذلان مصطفی بیٹھا تھا۔ سیاہ شلوار قمیض پہنے شہد رنگ آنکھیں چاند جمائے ہوئے تھا۔ قمیض کے بازو کہنیوں تک موڑے ہاتھ میں چھوٹا نیلا قرآن تھامے ہوئے تھا ۔ ہاسٹل میں رہتے ہوئے اس کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ رات کو سونے سے پہلے باہر پڑے بینچ پر بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ شہد رنگ آنکھیں چاند پر جمائے اس کی نظروں میں نیلی آنکھوں کا طلسم سا ابھر رہا تھا۔

اسے وہ رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ وہ لڑکیوں سے نگاہ جھکا کر بات کرتا تھا۔ بات بھی صرف کام کی حد تک مگر اس دن کی ہلکا سا نینوں کا ملاپ تھا اور اس کے کئی دنوں کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ خواب میں بھی اسے ایسی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ وہ خواب جس سلسلہ پچھلے چند ماہ میں رک چکا تھا اس لڑکی کی آنکھوں کو دیکھ کر اسے پچھلے چند دن سے ویسے ہی خواب پھر سے آرہے تھے۔ اس نے دماغ میں پھیلی سوچوں کو جھٹکا۔ اپنا قرآن لیا اور ہاسٹل کے اندر داخل ہوا۔ سڑھیاں چڑھ کر اوپری منزل پر آیا ۔ کھڑکی سے فیصل مسجد کا منظر واضح نظر آیا تو وہ مسکرا دیا۔ اسلام آباد میں اس کی پسندیدہ جگہ فیصل مسجد ہی تھی۔ کیا خوب شان تھی اس رب کی جس نے ان انسانوں کے ہاتھوں میں اتنا ہنر ڈال دیا کہ

وہ ایسا شاہکار تعمیر کر بیٹھے۔ وہ بیڈ پر سیدھا لیٹ گیا۔ اب وہ چھت کو تک رہا تھا۔ پھر کب نیند کی وادیوں نے اسے اپنے آغوش میں لیا وہ سمجھ نہ سکا۔

سیاہ گھنے جنگل میں وہ سیاہ چادر والی لڑکی واضح تھی ۔ اس کی نیلی آنکھوں میں رونے کی شدت سے لال لکیریں بن چکی تھیں۔ اس کا وجود زنجیروں سے جکڑا تھا۔ روڈ کے درمیان کھڑا اذلان مصطفی اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لڑکی ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی جانب بلایا۔ وہ کھینچتا چلا گیا۔ ہاں پر جب وہ قریب پہنچا تو اسے حیرت نے آن گھیرا۔ اس لڑکی کے ایک ہاتھ میں زنجیروں کی چابی موجود تھی۔ پھر وہ خود کیوں اپنی قید سے آزاد سے نہیں ہو رہی تھی؟ اس سے پہلے کے وہ چابی تھام کر اس کی زنجیریں توڑتا وہ زور زور سے رونے لگی۔ شاید اسے اپنی قید سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ آزادی چاہتی تھی اور نہیں بھی۔ وہ دو کشتیوں پر سوار ہو چکی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کس کشتی پر جانا تھا۔ ہاں وہ رو رہی تھی۔ اسے اپنی قید سے رہائی بھی چاہیے تھی اور اپنی قید میں رہنا بھی تھا۔

اذلان مصطفی یک دم خواب سے جگا رات کے دو بج رہے تھے۔ اس نے گہرے سانس لیتے خود کو نارمل کرنا چاہا۔ پھر پانی پی لیا۔

نا محرم کی محبت بس تباہی لاتی ہے۔ آج کل پاکستانی ٹین ایج لڑکے لڑکیاں اس گناہ میں دل کھول کر ملوث ہیں ۔ بات کرنے سے کیا ہوتا ہے یار ؟ اکثر یہی ہم اپنے کلاس فیلوز سے سناتے ہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ہمارے کتنے ہی کلاس فیلوز ایسے ہیں جن کے افیئر چک رہے ہوتے ہیں۔ اکثر سینئر ایسے ہوتے ہیں جن کے ایک سمیسٹر میں ایک تو دوسرے میں کوئی نئے افیئر باہر آ جاتے ہیں۔ چند دن یونیورسٹی میں ان کے بارے میں بات ہوتی ہے اور پھر دوبارہ وہ سب۔ کتنا عام لگتا ہے نہ یہ سب ہمیں اپنے ملک پاکستان میں؟ لیکن کیا یہ عام ہونا چاہیے تھا ؟؟ کبھی کبھی تو یقین نہیں ہوتا کہ یہ وہ ملک پاکستان ہے جسے اسلام کے نام پہ بنایا گیا تھا۔

محبت کرنا غلط نہیں ہے ، مگر اس محبت کو کس طرح حلال یا حرام بنا دیتے ہیں وہ غلط ہے۔ اگر آپ کو کوئی اچھا لگتا ہے تو یہ فطری ہے۔ آپ اس سے ایک بار واضح انداز میں محدود اور فاصلے سے بات کرے۔ اگر وہ بھی آپ کو پسند کرتا ہے تو گھر والوں کو بتا دے۔ گھر والے نہیں مانتے تو غلط طریقے اپنانے کی بجائے اپنے ماں باپ کے فیصلوں پر یقین رکھیں۔ دنیا ایک شخص اے ختم نہیں ہوتی ، کوئی ایک آپ کا نہیں ہو سکتا تو کیا ہوا ؟ جتنے رشتے آپ کے پاس موجود ہیں ان کے ساتھ خوشی سے رہیں۔ اور یاد رکھیں کہ :

" جنہیں اللہ کافی ہو جائے وہ کسی انسان کی کمی میں تباہ نہیں ہوتے۔"

☆~~~~~~~~☆

جمعہ کے بعد تمام طلبہ ہال میں جمع تھے۔ عائشہ آج یونیورسٹی آئی تھی ، اسے اپنی سٹی ہاسپٹل کی جاب کے فارم پر ایک پروفیسر کے سائن چاہیے تھے۔ سائن کروانے کے بعد واس کی کلاس فیلو فضا اسے اپنے ساتھ ہال میں لے لائی تھی۔ وہ اذلان نے گل گا رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا یہاں پر آکر سٹوڈنٹس کافی اچھا محسوس کرتے ہیں ۔ چند لمحوں بعد تمام طلبہ وہاں بیٹھ چکے تھے۔ یہ حیرانی کی بات تھی کہ کافی سٹوڈنٹس اس کی سپیچ سننے وہاں باقاعدہ طور پر آتے تھے۔ چند منٹوں بعد ہی اذلان آیا تھا۔ آج پروفیسر طارق نہیں آئے تھے۔ انہیں آرام کرنا تھا۔ اذلان نے بولنا شروع کیا تمام سٹوڈنٹس اسے غور سے سننے لگے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

آج میں جس موضوع پر بات کرنے جا رہا ہوں وہ ہے " ہدایت "۔ کتنا سادہ سا لفظ ہے نہ یہ؟ مگر کیا آپ جانتے ہیں کہ اس کی معانی کتنے کشادہ ہیں۔ ہدایت صرف راستہ بتانے کا نام نہیں، بلکہ انسان کے دل، سوچ، کردار اور زندگی کو اللہ کی مرضی کے مطابق

ڈھال دینے کا نام ہے۔ دنیا میں انسان کو بہت سے راستے نظر آتے ہیں، لیکن ہر راستہ منزل تک نہیں پہنچاتا۔ اصل کامیابی اس راستے کو پا لینا ہے جو اللہ تک لے جائے۔ اسی لیے ہدایت اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ قرآن میں ہے۔

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ○

ترجمہ: "یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں، یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔"

(سورۃ البقرۃ 2:2)

اللہ تعالیٰ نے قرآن کا تعارف کسی عام کتاب کے طور پر نہیں کروایا، بلکہ ایسی کتاب کے طور پر کیا جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ ہدایت ہے، مگر ہر اس شخص کے لیے نہیں جو صرف اسے پڑھ لے، بلکہ ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، حق کو قبول کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں، اور اپنی زندگی کو بدلنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ قرآن کسی پر زبردستی اثر نہیں ڈالتا۔ وہی دل اس سے روشنی حاصل کرتا ہے جو تکبر، ضد اور خواہشات کی غلامی سے نکل کر اللہ کی طرف جھکتا ہے۔ اگر دل بند ہو تو سورج کی روشنی بھی بند کمرے میں داخل نہیں ہو سکتی۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ ○

ترجمہ: "بے شک یہ قرآن اس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے۔"

(سورۃ الإسراء 17:9)

دنیا میں انسان کو ہزاروں نظریات، فلسفے اور راستے ملتے ہیں۔ ہر شخص اپنی سوچ کو درست سمجھتا ہے، مگر اللہ فرماتا ہے کہ سب سے سیدھا، متوازن اور محفوظ راستہ صرف قرآن کا راستہ ہے۔ یہ راستہ انسان کے عقیدے کو بھی درست کرتا ہے، اخلاق کو بھی سنوارتا ہے، عبادات کو بھی منظم کرتا ہے، معاملات کو بھی پاکیزہ بناتا ہے اور آخرت کی کامیابی بھی عطا کرتا ہے۔ قرآن انسان کو صرف جنت تک نہیں لے جاتا، بلکہ دنیا میں بھی سکون، عدل اور مقصدِ حیات عطا کرتا ہے۔ ہدایت صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ○

ترجمہ: "بے شک آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔"

(سورۃ القصص 28:56)

یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب کے واقعے کے پس منظر میں نازل ہوئی۔ نبی کریم ﷺ انہیں بہت چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ ایمان لے آئیں، لیکن اللہ نے واضح فرما دیا کہ دلوں کو بدلنے کا اختیار صرف اسی کے پاس ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کی کوشش بے معنی ہے، بلکہ یہ کہ دعوت دینا ہمارا کام ہے اور دلوں کو ہدایت دینا اللہ کا کام ہے۔ اس آیت سے عاجزی پیدا ہوتی ہے کہ اگر ایمان ملا ہے تو یہ ہماری قابلیت نہیں، بلکہ اللہ کا فضل ہے۔ایک سب سے عظیم دعا آپ سب کو بتانے جا رہا ہوں۔ کوشش کیا کرے کہ اسے ہر نماز کے بعد پڑھا کرے۔

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ○

ترجمہ: "ہمیں سیدھا راستہ دکھا اور اس پر ثابت قدم رکھ۔"

(سورۃ الفاتحہ 1:6)

یہ دعا ہر مسلمان دن میں کئی مرتبہ نماز میں دہراتا ہے۔ اگر ہدایت ایک مرتبہ مل جانے والی چیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ ہر رکعت میں یہ دعا نہ سکھاتا۔ اس دعا کا مطلب صرف "راستہ دکھا" نہیں، بلکہ حق کو پہچاننے کی توفیق دینا ، اس پر عمل کرنے کی ہمت دینا ،

آزمائشوں میں ثابت قدم رہنا ، گمراہی سے بچانا ، زندگی کے آخری سانس تک ایمان پر قائم رکھنا بھی ہیں۔

اصل ہدایت وہ ہے جو انسان کو موت تک اللہ کی اطاعت پر قائم رکھے۔

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ○

ترجمہ: "اور جو لوگ ہدایت اختیار کرتے ہیں، اللہ انہیں مزید ہدایت عطا کرتا ہے اور انہیں تقویٰ نصیب فرماتا ہے۔"

(سورۃ محمد 47:17)

ہدایت ایک ایسا خزانہ ہے جو استعمال کرنے سے کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے۔ جو شخص قرآن پر عمل کرتا ہے، اللہ اس کے لیے علم کے نئے دروازے کھول دیتا ہے، اس کی سمجھ میں اضافہ کرتا ہے، اس کے دل میں گناہوں سے نفرت اور نیکیوں سے محبت پیدا کرتا ہے۔ جیسے ایک چراغ دوسرے چراغ کو روشن کرتا ہے، اسی طرح ایک نیکی دوسری نیکی کی توفیق کا سبب بنتی ہے۔

ہدایت کی علامت جانتے ہیں کیا ہے؟

فَمَن يُرِدِ اللّٰهُ أَن يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ○

ترجمہ: "پس اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔"

(سورۃ الأنعام 6:125)

ہدایت کی سب سے بڑی نشانی دل کا کھل جانا ہے۔ جب اللہ کسی بندے سے خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو عبادت اسے بوجھ نہیں لگتی۔ قرآن سن کر دل نرم ہو جاتا ہے۔ گناہ کے بعد بے چینی محسوس ہوتی ہے۔ توبہ میں سکون ملتا ہے۔ دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر ہونے لگی رہتی ہے۔ اللہ کی رضا انسان کی سب سے بڑی خواہش بن جاتی ہے۔

یہی "شرحِ صدر" ہے، یعنی دل کا اسلام کے لیے کھل جانا۔ اور حقیقی کامیاب جانتے ہیں کون ہوتا ہے؟ میرا اللہ فرماتا ہے:

مَن يَهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۖ وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ○

ترجمہ: "جسے اللہ ہدایت دے، وہی حقیقت میں ہدایت یافتہ ہے، اور جسے وہ گمراہ چھوڑ دے، اس کے لیے آپ کوئی رہنمائی کرنے والا دوست نہیں پائیں گے۔"

(سورۃ الکہف 18:17)

دنیا لوگوں کو ان کے مال، شہرت، اقتدار اور علم سے پہچانتی ہے، لیکن اللہ کے نزدیک اصل معیار ہدایت ہے۔ اگر کسی کے پاس پوری دنیا ہو مگر اللہ کی ہدایت نہ ہو تو وہ حقیقی کامیاب نہیں۔ اور اگر کوئی دنیا کے اعتبار سے کمزور ہو، مگر اس کا دل ایمان اور تقویٰ سے روشن ہو، تو وہی اللہ کے نزدیک کامیاب ہے۔ اسی لیے مومن کی سب سے بڑی فکر رزق، مقام یا شہرت نہیں، بلکہ یہ ہونی چاہیے کہ "یا اللہ! میرا دل ہدایت پر قائم رکھ۔

آخر میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ ہدایت وہ روشنی ہے جو آنکھوں سے نہیں، دل سے دیکھی جاتی ہے۔ یہ کتابوں سے زیادہ اللہ کی رحمت سے ملتی ہے، اور دعا، اخلاص، عاجزی اور قرآن سے تعلق رکھنے والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جب اللہ کسی بندے کو ہدایت عطا کرتا ہے تو اس کی زندگی بدل جاتی ہے، اور جب وہ ہدایت پر ثابت قدم رہتا ہے تو اس کی آخرت سنور جاتی ہے۔ اس لیے دنیا کی ہر نعمت سے پہلے اور ہر دعا سے بڑھ کر یہی دعا مانگنی چاہیے:

"اے اللہ! ہمیں حق کو حق سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما، باطل کو باطل سمجھنے اور اس سے بچنے کی ہمت دے، ہمارے دلوں کو قرآن کے نور سے زندہ فرما، اور ہمیں زندگی کے آخری لمحے تک صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ۔ آمین۔"

☆~~~~~~~~~☆

وفا کے قید خانوں میں ، سزائیں کب بدلتی ہیں؟

بدلتے دل کے موسم میں ، ہوائیں کب بدلتی ہیں؟

میری ساری دعائیں ، تم سے ہیں منسوب ہمدم۔

محبت ہو اگر سچی ، دعائیں کب بدلتی ہیں؟

کوئی پاکر بھلاتا ہے ، کوئی کھو کر نبھاتا ہے۔

نئے انداز ہوتے ہیں ، وفائیں کب بدلتی ہیں؟

کراچی کی طرف رخ کرو تو میر ہادی اپنے پینٹ ہاوس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کلفٹن کے گھرے گھنے جنگل میں موت کی سی خاموشی تھی۔ ہادی کا کمرا ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ شاید آج پھر میر ہادی کے اندر کسی سے اپنی بے وفائی کا بدلہ لینے کی چاہ پیدا ہوئی تھی۔ وہ عائشہ کو مار دینا چاہتا تھا ، اسے اس لڑکی کے وجود سے اس کی آنکھوں سے بے پناہ نفرت محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب سے گئی تھی اپنے ساتھ اس کا چین بھی لے گئی تھی۔ فقط چند مہینوں کی محبت نے اسے کہیں نہ چھوڑا تھا۔ پورے کمرے کی ہر ایک چیز ٹوٹی

ہوئی تھی اور وہ ایک کونے میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے گئے ہوئی ایک سال ہونے کو تھا۔ اس سے ایک سال قبل اس نے عائشہ صدیقی کی روح تک سے بے پناہ محبت کی تھی۔ اگلا یہ سال اس نے عائشہ صدیقی سے بے پناہ نفرت کی تھی۔ تھی کیا وہ ؟ کیا اوقات تھی اس کی؟ فقط ایک لڑکی جس کے لیے میر ہادی کے جذبات دو حصوں میں بٹ چکے تھے۔ آدھا دل آج بھی کہتا تھا تمہیں اس سے محبت ہیں۔ آدھا دل چیخ پر بولتا تھا نفرت ہے۔ فقط نفرت ۔ اور کئی مرتبہ نفرت ہر جذبے پر بھاری ہوتی ہے۔ محبت تھی تو بے پناہ تھی ، اب نفرت تھی تو جنون کی حد تک تھی۔ وہ اسے چھوڑ گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی جو تکلیف اس نے محسوس کی تھی وہ بھی کرتا۔ کرتا وہ تکلیف برداشت اور جانتا کہ اس کی وجہ سے کتنے لوگوں کی زندگیاں اجڑ گئی تھیں۔ کون تھا جو میر ہادی کو محبت کی ان زنجیروں سے آزاد کرواتا ؟

ہوائیں تیز ہوئیں تو انہوں نے اپنا رخ اسلام آباد کی جانب پھیرا ۔ جہاں اذلان مصطفی اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ دو سال پچھلے دو سال اذلان مصطفی نے جس خواب کو دیکھا تھا۔ جن نیلی آنکھوں کو دیکھ کر وہ کئی راتیں سو نہیں سکا تھا۔ وہ نیلی آنکھیں جب خوابوں سے سفر طے کرتیں حقیقت میں اس کے سامنے لا کھڑی کر دی گئی تھیں تو اسے ان سے خوف

محسوس ہوا تھا۔ اپنایت بھی تھی مگر خوف ہر شے پر حاوی تھا۔ بس ایک بار اس نے عائشہ کو دیکھا تھا اور کتنے ہی دن وہ سو نہیں سکا تھا۔ وہ کیا جانتا تھا کہ وہ آنکھیں اس کی زندگی مکمل کرنے کی طاقت رکھتی تھیں۔ جس مکان کو گھر بنانے کے خواب اذلان مصطفی دیکھا کرتا تھا وہ پورا ہو سکتا تھا۔ کیا وہ کر سکتی پورا ؟ وہ کئی کئی گھنٹے اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ نجانے کیوں ؟ یہ سوال اسے خود بھی سمجھ نہیں آتا تھا۔ کئی مرتبہ اسے لگنے لگتا تھا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ کئی مرتبہ وہ اس لڑکی کے خیال کو ذہن سے جھٹکتا تھا۔ مگر اسے یہ احساس تک نہیں ہوا تھا کہ وہ مریض عشق بنتا جا رہا تھا۔ اذلان اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے لگا تھا، اسے رب نے اسی لڑکی سے محبت کروائی تھی جو اس جیسی تھی۔ لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اذلان نے تصویر کا ایک رخ دیکھا تھا، دوسرا اسے قسمت دکھانے والی تھی۔

کئی زنجیریں ایسی ہوتی ہیں جو معاشرہ آپ کر گرد باندھ دیتا ہے۔ کچھ زنجیریں ہمارے گھر والے ہمارے گرد لپیٹ دیتے ہیں۔ اور سب سے خطرناک زنجیریں جانتے ہیں کون سی ہوتی ہیں؟ محبت کی زنجیریں۔ ان زنجیروں کی چابیاں محبوب کے ہاتھ میں ہوتیں ہیں۔ ان زنجیروں کو محبوب ہی توڑ سکتا ہے۔ اذلان اور ہادی کی زنجیروں کی چابی عائشہ صدیقی کے

ہاتھ میں بندھ چکی تھی۔ عائشہ کے بس میں نہ تھا کہ وہ کسی ایک کو بھی آزاد کر پاتی۔ کیا وہ آزاد ہو سکتے تھے؟ محبت کہ اس چکر میں اگر کوئی جیت رہا تھا تو وہ صرف قسمت تھی۔ جو دور سے ان تینوں پر ہنس رہی تھی۔

☆~~~~~~~~~☆

رات کھانے کی میز پر ہاجرہ بی نے نوٹ کیا تھا کہ عائشہ کافی الجھی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ آج کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔

" عائشہ ٹھیک ہو؟ " ہاجرہ بی نے اسے دیکھتے پوچھا۔

"آپ کو پتا ہے۔ ہماری یونیورسٹی میں ہر جمعہ کو ایک شخص سپیچ کرتا ہے۔ پہلے میں کبھی سننے نہیں گئی تھی۔ مگر آج وہ فضا مجھے لے گئی آپ کو پتا ہے مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ شخص۔۔اذلان۔۔وہ اتنا اچھا بولتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ اس کے الفاظ میں جادو تھا۔ میں نے ایک دن اسے سنا اور مجھے اتنا سکون ملا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ جس نفاست سے وہ آیات بولتا ہے۔۔" وہ بولے گئی۔ ہاجرہ بی اسے غور سے دیکھ رہیں تھیں۔ پہلے وہ بول نہیں رہی تھی اور اب چپ نہیں کر رہی تھی۔ ہاجرہ بی مسکرا دیں۔ شاید وہ جانتی تھی کہ وہ کون تھا۔

" اچھا اتنا اچھا ہے وہ ؟ " وہ ابرو اچکا کر بولیں۔

" میرا مطلب اچھا نہیں۔۔پر وہ بہت نیک لگتا ہے۔ بلکل۔۔بلکل کسی درویش کی طرح۔ ہاں اس کا حلیہ درویشوں جیسا نہیں ہے۔ اس کے چہرے پر اتنا نور ہے ، جیسے وہ اللہ کا محبوب ہو۔ کاش ! میں بھی اللہ کی محبوب ہوتی۔ شاید میں ہو نہیں سکتی ، میرے ماضی کے گناہ بہت بڑے تھے۔" وہ اداس سی بولی۔

" دیکھو عائشہ ۔۔ انسان دل سے توبہ کرے تو اللہ ہر گناہ بخش دیتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے غلطیاں کرنا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان غلطیوں کو سدھارا نہیں جاسکتا۔ اور رہی بات اللہ کے محبوب ہونے والی۔۔تو تم چاہو تو تم بھی اللہ کی محبوب ہو سکتی ہو۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے پیار سے بول رہیں تھیں۔

" کیسے ؟ " اس نے آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

" تم بس خدا کو جانو ، باقی خدا جانے اور اس کی عطا جانے۔" عائشہ نے سر کو خم دیا۔

" می می۔۔واجبرنی کا کیا مطلب ہوتا ہے ؟ " اس نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے کہا۔

" جب نماز میں دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھتے ہیں نا ؟ تو اس دعا میں کہتے ہیں نہ کہ

اللھم اغفرلی وار حمنی وعافنی واھدنی وارزقنی واجبرنی وارفعنی ○

جب کبھی انسان کو کہیں چیرا لگ جائے ، گرم خون تیزی کے ساتھ بھل بھل گر رہا ہو۔ شدت سے رگوں کو کاٹ دینے والا درد ہو رہا ہو۔ تو ایسے وقت میں اگر کوئی اس جلتے ہوئے زخم پر مرہم رکھ دے تو اس مرہم رکھنے کے عمل کو کہتے ہیں واجبرنی۔

جب بندہ اللہ سے دونوں سجدوں کے درمیان والی خوبصورت پوزیشن میں بیٹھ کر دل سے کہتا ہے کہ " واجبرنی " تو وہ دراصل اس وقت اپنی ذہنی ، جسمانی اور روحانی ہر طرح کی شکستگی کا مرہم اللہ سے مانگ رہا ہوتا ہے۔ انسان کے سارے مرہم نماز میں موجود ہوتے ہیں۔"
ہاجرہ بی اسے سمجھا رہیں تھیں اور وہ غور سے ان کو سن رہی تھی۔

" اچھا اب بلا لوں نہ آسیہ کو اتوار والے دن ؟ " ہاجرہ بی بولیں ۔

" نہیں ابھی رہنے دیں۔۔مجھے کچھ دن کا وقت چاہیے ۔" اس نے ان کو دیکھتے کہا۔

" ایک بتاؤں تمہیں؟ تم جس اذلان کی سپیچ کی بات کر رہی تھی نہ؟ آسیہ کا نواسا وہی ہے۔" ہاجرہ بی نے بڑے آرام سے اس کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

" کیا ؟؟ تو۔۔کیا وہ بھی جانتا ہے کہ میں؟ " اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

" نہیں۔۔وہ نہیں جانتا۔ ابھی آسیہ نے اس سے بات نہیں کی۔ مگر وہ کہتی ہیں کہ اذلان ان کو انکار نہیں کرے گا۔" ہاجرہ بھی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

" مجھے کچھ وقت چاہیے۔۔آپ ان کو ابھی نہ بلائیں پلیز۔۔" وہ التجا کر رہی تھی۔ ہاجرہ بھی نے اس کی بات مان لی۔ وہ جانتی تھیں، پچھلا زخم گہرا تھا۔ اس نئے رشتے کے لیے اس بہت وقت لگنا تھا۔ عائشہ کمرے میں اکیلی روتی تھی۔ اسے لگتا تھا ہاجرہ بی اس کے آنسوؤں سے بے خبر ہیں۔ بھلا کبھی کوئی ماں بھی اپنے بچوں سے بے خبر رہی ہے؟ وہ اس کی پھوپھو تھیں مگر ماں سے کم بھی نہ تھیں۔ اتنی اچھی پھوپھو تو بس نصیب والوں کو ملتیں ہیں۔

" اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔"

☆~~~~~~~~~☆

جمعرات کو اذلان نانو کے گھر آیا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا، نانو اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ اس نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ شاید وہ کوئی بات کرنا چاہتی تھیں بار بار اذلان کو دیکھتی اور پھر نظریں جھکا کر اپنا کام کرنے لگتیں۔

'' کیا بات ہے نانو۔۔پہلے تو آپ نے کبھی میرے ساتھ کوئی بات کرتے ہوئے اتنا نہیں سوچا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

'' بس بات ہی ایسی ہے۔۔کیا کروں۔۔'' وہ مصروف سے انداز میں بولیں تو اذلان نے ابرو اچکائے۔

'' اچھا ایسی بھی کیا بات ہے؟ '' اذلان نے عام سے انداز میں بولا اور پانی پینے لگا۔

'' شادی کر لو اب کب تک ایسے رہو گے؟ '' وہ بولیں تو اذلان کو یک دم اچھو لگا۔ اس نے حیرت سے نانو کو دیکھا۔

'' یہ یک دم شادی کا خیال کہاں سے آیا؟ '' اس نے پانی کا گلاس رکھتے کہا۔

'' یہ ہمسائے میں جو نئے لوگ شفٹ ہوئے ہیں نہ؟ جن کا تمہیں میں نے بتایا تھا ارے ہاجرہ۔۔'' وہ اس یاد کروا رہیں تھیں۔

'' جی۔۔کیا ہے ان کو؟ '' وہ ایسے سن رہا تھا جیسے دنیا ہل گئی ہو۔

'' اس کے ساتھ اس کے بھائی کی بیٹی رہتی ہے۔ بہت پیاری بچی ہے ملی تھی میں جب ادھر شفٹ ہوئے تھے وہ لوگ۔۔ تم ایک بار مل لو۔'' وہ ایسے بولیں جیسے کوئی بات ہی نہ

ہو۔ اذلان نے دھڑکتے دل پر قابو پانا چاہا۔ اب انہیں کیسے بتاتا وہ تو خود ان سے اپنی محبت کا ذکر کرنے آیا تھا۔

" نانو۔۔مجھے دراصل۔۔ایک لڑکی اچھی لگتی ہے۔ میں اس شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اذلان نے کہا تو نانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ ایسا نہیں تھا کہ لڑکیوں کے آگے پیچھے گھومتا۔

" اچھا کون ہے وہ؟ " وہ ابرو اچکا کر بولیں۔

" وہ میری یونیورسٹی کی ہے۔ جونیر ہے ایک سال۔ اسے ابھی نہیں پتا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ میں اس سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گا۔آپ میرے ساتھ اس کے گھر چلے گئی نہ؟ " وہ التجا کر رہا تھا۔ پہلی بار وہ کسی لڑکی کے لیے التجا کر رہا تھا۔ آسیہ کو اس پر ترس آیا۔

" اچھا کر لے بات۔۔پھر بتانا مجھے۔ چھپا رستم کہیں کا۔" وہ منھ بنا کر بولیں۔

" نام تو بتا دے اب خوش نصیب کا جس کو اتنا اچھا شوہر مل رہا ہے۔" وہ ہنس کر بولیں۔ افففف اللہ نانو اسے چھیڑ رہیں تھیں۔ وہ شرما گیا۔ اللہ وہ لڑکا ہو کر شرما گیا؟

'' نانو آپ بھی نا۔۔مجھے نہ چھیڑا کرے میں شرماتا بھی ہوں۔'' وہ اس انداز میں بولا کہ نانو ہنس دیں۔ اذلان کا موبائل تھرتھرایا تو اس نے چیک کیا ۔ اس کی سٹی ہاسپٹل میں جاب کی لسٹ لگ گئی تھی۔ اس کا اور عائشہ کا نام سٹی ہاسپٹل میں ایک ساتھ آیا تھا۔

یہ سٹی ہاسپٹل تھا۔ عائشہ کو وہاں جاب شروع کیے چند دن ہی ہوئے تھے۔ اذلان اور عائشہ ساتھ کام کر رہے تھے ۔ عائشہ نے اس سے کسی اور مطلق بات نہیں کی تھی۔ کام کافی زیادہ ہوتا تھا سو وہ دونوں ہی کافی مصروف ہوتے تھے۔ آج کام کم تھا سو وہ جلدی فری ہو گئے تھے۔ کیفے میں بیٹھے وہ کھانا کھا رہے تھے۔

'' عائشہ۔۔کیا میں آپ سے بات کر سکتا ہوں؟ '' وہ نگاہیں جھکائے بولا۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھتا تھا اسے لگتا تھا اس کی نظریں ملیں تو محبت عیاں ہو جائے گی۔

''آگے بھی ہم بات ہی کرتے ہیں کام کے دوران۔ کہیے۔۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ اذلان اچھا انسان تھا۔ عائشہ کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ اس کے قریب محفوظ محسوس کرتی تھی۔ میر ہادی کے قریب اس نے کبھی بھی محفوظ محسوس نہیں کیا تھا۔ تحفظ کا یہ احساس ہر احساس پر بھاری تھا۔

" میری بات کا برا مت مانیے گا۔ آپ کی انکار یہ اقرار بہت معانی رکھتا ہے۔ اگر آپ انکار کرے گی تو دوبارہ کبھی ایسی بات نہیں کہوں گا۔ اگر آپ نے اقرار کیا تو تمام عمر آپ کی حفاظت کروں گا۔

کیا آپ اذلان مصطفیٰ سے شادی کرے گئیں؟ کیا آپ اس شخص سے شادی کرے گئ جس نے آپ کے سوا آج تک کسی اور کے خیال کو اپنے تصورات میں بھی بھٹکنے نہیں دیا۔ کیا آپ اس شخص سے شادی کرے گی جس کے پاس فقط ایک مکان ہے۔ کیا آپ اس مکان کو گھر بنائے گئیں؟ " نظریں اس کے جوتوں پر جمائے وہ بولا تو با کمال لگا۔ سیاہ سال لیے ، سفید شلوار قمیض میں ملبوس وہ مرد کسی کے بھی دل کی دنیا ہلا سکتا تھا۔

" میں انکار نہیں کرتی ، مگر آپ کو میرا سچ جاننا چاہیے۔ جب انسان کوئی رشتہ جوڑتا ہے تو اس کے متعلق ہر شے کا علم بھی ہونا چاہیے۔ میں آپ جیسے با کردار مرد کو ڈیزرو نہیں کرتی۔ میر ہادی کو جانتے ہیں آپ ؟ میرا اس سے کئی مہینوں تک افئیر رہا ہے۔ میں اسے بھول نہیں پا رہی ۔ میرا والد کو اس نے قتل کیا تھا۔ اس واقعے کے بعد ہی میں یہاں آئی۔ کیا آپ مجھ جیسی بد کردار لڑکی کو اپنائے گے؟ جس کے پاس آپ کے دینے کے

کچھ بھی نہیں۔ جذبات بھی نہیں۔۔۔" وہ اس انداز میں بولی تھی کہ وہ خود اسے انکار کردے۔ وہ اس جیسے انسان سے کیا توقع کر رہی تھی؟

" اپناؤں گا۔۔"یک لفظی جواب دیا گیا۔ عائشہ نے نم آنکھیں لیے حیرت سے اسے دیکھا۔

"پچھلے ایک ماہ سے ہم ساتھ کام کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو کبھی میرے کردار میں خامیاں نظر نہیں آئیں؟ " وہ رو دینے کو تھی۔

" میں نے آج تک آپ کے کردار میں خامیاں نہیں دیکھیں تو نظر کہاں سے آتیں؟ " وہ سوالیہ انداز میں بولا۔ اسے حق نہ تھا ورنہ وہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھتا اور پوچھتا کہ وہ کیوں خود کو اتنا بے وقعت سمجھ رہی تھی؟ وہ خود کو اذلان مصطفی کی نگاہوں سے دیکھتی جانتی کہ وہ اسے کتنا پاک اور با کردار تصور کرتا تھا۔ ماضی کی ایک غلطی کو وہ اس پر مسلط کیوں کرتا؟ انسان غلطیاں ہی کرتا تھا۔ زندگی میں ایسے کوئی موقعے آئے ہوں کہ اذلان سے بھی غلطیاں ہوئی ہو گئی؟ انسان تو پر فیکٹ ہوتے ہی نہیں ۔ پر فیکٹ تو بس اللہ اور اس کے رسول کی ذات تھی۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور پھر چلی گئی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس شخص کو کیا جواب دیتی۔

☆~~~~~~~~☆

رات کے 9 بجے کا وقت تھا۔ بہرام ولید اپنی پولیس وین میں گھر جا رہا تھا۔ جب اس کی نظر روڈ پر زخمی حالت میں پڑی ایک لڑکی پر گئی۔ وہ لڑکی دیکھنے سے یہاں کی ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی زخمی حالت دیکھ کر بہرام یک دم پریشان ہوا ، اس نے پولیس سٹیشن کال کر کے اپنے دو سپاہیوں کو یہاں بلایا۔ دونوں سپاہی وقت پر اس روڈ پر آگئے تھے ساتھ ہی بہرام کے کہے کے مطابق وہ ایمبولینس بھی لے آئے تھے۔اس لڑکی کو ایمبولینس میں ڈال کر ہاسپٹل لے کر جایا گیا۔ البتہ وہ لڑکی بار بار میر ہادی کا نام بے ہوشی کی حالت میں لے رہی تھی۔ وہ کافی زخمی تھی۔ جبکہ بہرام سپاہیوں کو ہدایت کر کے اس لڑکی کے پاس رہ کر اس کا علاج کروانے کی تاکید کر کے جا چکا تھا۔

بہرام گھر کے اندر داخل ہوا ، وہ کافی الجھا ہوا تھا۔ اسے پہلے اس کالم کو پڑھ کر کے میر ہادی پر کافی شک ہوا تھا۔ اوپر سے اس لڑکی کا بار بار میر ہادی کا نام لینا اسے سوچ میں ڈال رہا تھا۔ لاونج میں داخل ہوتے بہرام کی پہلی نظر ایمان پر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ساری پریشانی اسے دیکھ کر غائب ہوئی تھی۔ وہ جو مصروف سی اس کے کپڑے سیٹ کر رہی تھی۔

" تو کب سے جا رہی ہو یونیورسٹی؟ " بہرام نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

" اگلے مہینے سے۔۔ آپ کو پتا ہے میری یونیورسٹی والوں سے آج بات بھی ہوئی۔ وہ کہہ رہے تھے اے ایس پی کی بیوی ہے آپ کو تو ڈسکاؤنٹ بھی دے دیں گے۔" وہ پر جوش سی اسے بتا رہی تھی۔

" تم نے پھر بتا دیا کہ میں اے ایس پی ہوں ؟ مسجد میں اعلان ہی کروا دو کسی دن۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

" بہرام! منہ دیکھتے رہیے گا میں تو کروا بھی دوں گی۔" وہ ہنس کر بولی۔

" اچھا تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ میں پڑا ہے۔ آو دکھاتا ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے گیراج لایا۔

" اب ایسا بھی کیا ہے ؟ " وہ پر جوش سی بولی۔ بہرام نے گاڑی کی پچھلی سیٹ سے ایک چھوٹی سی ڈبی اور پنک ٹیولپس کا بکے نکالا۔ وہ پر جوش سی ہو کر آگے بڑھی اور بکے تھام لیا۔ ایمان کو پھول بہت پسند تھے اور بہرام یہ بات جانتا تھا ۔ پھر کیوں نہ لاتا وہ اس کے لیے پھول۔ ساری دنیا سرخ گلابوں پر مرتی تھی مگر بہرام ولید کی بیوی کو ٹیولپس پسند تھے۔ اور کیوں نہ ہوتی وہ سب سے الگ ؟ وہ تو بہرام ولید کی پسندیدہ عورت تھی نہ ؟

" کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں جہاں دل کرتا ہے وہ وہیں تھم جائیں اور انسان ان لمحوں میں قید ہو جائے۔ وہ ایک لمحے میرا لیے یہی ہے بہرام۔ " ایمان نے محبت بھری نظروں سے بہرام کو دیکھتے بولا۔ جو لوگ شادی سے پہلے محبت کرتے ہیں ان کی سٹوری شادی سے پہلے شروع اور شادی کے بعد ختم ہوتی ہے۔ مگر جو لوگ شادی کے بعد محبت کرتے ہیں ان کی سٹوری شادی کے بعد شروع ہوتی ہے اور ختم ہوتے ہوتے تمام عمر گزر جاتی ہے۔

" اگر آپ کہیں گی تو روز لا دیا کروں گا بیگم ۔ پھر آپ یہ منظر روز دیکھ سکے گیٔ۔" وہ اس کے بال کان کے پیچھے اڑیستے بولا۔

عائشہ کے اس واقعے کے بعد ایمان پر بھی بہت اثر پڑا تھا۔ ایمان نے اپنے بابا کے کہنے پر بہرام ست شادی کر لی تھی۔ ماں باپ کا ایک فیصلہ بیٹیوں کی زندگی سنوار بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے۔ ایمان کے گھر والوں کا ایک فیصلہ اس کی زندگی میں بہت ساری خوشیاں لے آیا تھا۔ وہ بہرام کے ساتھ بہت خوش تھی۔ بہرام کوئی شکی مزاج مرد نہیں تھا۔ وہ پولیس میں کام کرتا تھا۔ باہر اس میں جتنا بھی غصہ کیوں نہ ہوتا۔ گھر آنے سے پہلے وہ اپنا غصہ بھی گھر کے باہر چھوڑ کر ہی آتا تھا۔

'' مردوں کو اپنا غصہ گھر سے باہر ہی چھوڑ کر آنا چاہیے۔''

بہرام وہ مرد تھا جس نے اپنی کبھی بھی اپنی ڈیوٹی اور اپنے جذبات کو ایک دوسرے کے بیچ میں نہیں آنے دیا تھا۔

'' بہرام ہمیشہ میرے ساتھ رہیے گا پلیز۔'' وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔ وہ دونوں اس وقت لان کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

'' اگر زندگی ایک سفر ہے تو میں چاہتا ہوں ہر قدم تمہارے ساتھ چلوں۔'' وہ مسکرا کر بولا اور ایمان کے ماتھے پر بوسا دیا۔

'' کبھی کبھی کسی کا آپ کے ساتھ ہونا ہی کئی زخموں پر مرہم رکھ دیتا ہے۔''

'' ایمان۔۔کیا تم میر ہادی کے بارے میں کچھ جانتی ہو ؟ تم نے بتایا تھا نہ تمہاری ایک دوست عائشہ اس کے کافی کلوز تھی۔'' بہرام نے اسے دیکھتے ہوا پوچھا۔

'' زیادہ تو نہیں جانتی۔۔مگر جب عائشہ کے والد کی دیتھ ہوئی تھی تب اس کے محلے سے ہی پتا چلا تھا کہ میر ہادی نے اس کے بابا کو مارا تھا۔ اس نے یہ اطراف بھی کیا تھا کہ جو افوائیں اس کے خلاف گرداش کر رہی ہیں وہ سچ تھیں۔۔مگر میں نے صرف سنا تھا۔

میں موقعے پر وہاں موجود نہیں تھی۔" ایمان ساری تفصیل بہرام کو بتائی تھی۔ وہ جانتی تھی بہرام ہادی کو پکڑنے کے لیے ثبوت اکٹھے کر رہا ہے۔

" اور یہ عائشہ کہاں گئی؟ اگر وہ کوٹ میں میر ہادی کے خلاف گواہی دینے پر تیار ہو جائے تو بہت جلدی یہ کیس حل ہو سکتا ہے۔" بہرام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

" یہ تو میں نہیں جانتی وہ اور اس کی پھوپھو ایک ہفتے بعد ہی شہر چھوڑ گئیں تھیں۔ میرا خیال ہے میر ہادی بھی اسے ڈھونڈ رہا ہے۔" ایمان نے کہا تو بہرام ولید گہری سوچ میں چلا گیا۔ اسے عائشہ صدیقی کو ڈھونڈنا تھا۔

اگلے دن بہرام اس اخبار کے دفتر آیا تھا جن کی کتاب پر وہ کالم چھاپا گیا تھا۔ اسے اس انسان تک پہنچانا تھا جس نے وہ کالم لکھا تھا۔ وہ دفتر کے اندر داخل ہوا تو پہلے تو کسی نے بہرام کی بات تک نہیں سنی۔

" مجھے آپ کے مینجر سے ملنا ہے۔" بہرام نے ریسیپشن پر کھڑے اس لڑکے سے کہا۔

" سوری سر وہ نہیں ہے۔ آپ کو کیا کام ہے مجھے بتا دیں۔" اس دبلے پتلے لڑکے نے بہرام سے کہا تو بہرام کو کوفت ہوئی۔ اسے اپنے کام میں رکاوٹ پسند نہیں تھی۔

" دیکھو لڑکے۔ میں ای ایس پی بہرام ولید ہوں۔ اب بلاؤ اپنے مینجر کو۔" بہرام نے حکمیہ انداز میں کہا۔

" ہاں اور میں کراچی کا صدر میر ہادی ہوں۔" وہ بہرام کا مذاق اڑاتا بولا۔ یہ اس سنگل پسلی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ بہرام نے بنا کچھ سوچے سمجھے اس کے گال پر اپنا بھاری ہاتھ رسید کر دیا۔ وہ لڑکا لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔ اسے دن میں تارے نظر آئے۔

" میر ہادی کو بہرام ولید سے بس یہی مل سکتا ہے۔" بہرام نے کوفت سے کہا اور بنا کچھ سمجھے مینجر کے آفس کی جانب بڑھ گیا۔

" ایک تو لوگوں کو عزت راس نہیں آتی۔" وہ بڑبڑاتا آفس کے اندر داخل ہوا۔ پیچھے سے وہ سنگل پسلی بھگتا ہوا اسے روکنے آیا۔ مگر جیسے ہی بہرام پیچھے مڑا اس نے ڈر کر اس سے فاصلے پر ہی قدم روک دیے۔ بہرام نے میسنی ہنسی ہنسا اور آفس میں اندر کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا۔ مینجر نے پہلے حیرت سے اور پھر خوشی سے بہرام کو دیکھا۔ اے ایس پی اس کے آفس میں تھا۔ اس کی تو شان بڑھ گئی تھی۔

" سر میں نے اسے بہت روکا پر یہ گینڈا اندر آ گیا۔" پیچھے سے وہ سنگل پسلی پھر بولا تو بہرام نے مٹھی بینچ لی۔

" اگر آپ اپنی ٹیم سے ایک لڑکا نہیں کھونا چاہتے مسٹر جافری تو اسے کہے یہاں سے چلا جائے۔" بہرام نے بڑے ضبط سے مینیجر سے کہا۔ مینیجر نے اس لڑکے کو جانے کا اشارہ کیا۔

" سوری۔۔لڑکا نیا رکھا ہے۔" مینیجر نے معذرت کی۔

" ہاں ہاں۔۔ٹھیک ہے۔ مجھے یہ بتاو اس کالم کو کس نے لکھا ہے۔ اس کا فون نمبر اور پورا ایڈریس چاہیے مجھے۔" بہرام نے اخبار کا وہ ٹکڑا مینیجر کی جانب پھینکا۔

" ارے یہ کالم تو مس عائشہ نے لکھا ہے۔ نیا نیا ہمارے لیے لکھنا شروع کیا ہے اس لڑکی نے۔" مینیجر نے بتایا پھر اس کا فون نمبر اور ایڈریس بھی دے دیا۔

واپس جاتے ہوئے بہرام نے ایک نظر اس لڑکے پر ڈالی جو سہم کر کہیں اور سیکھنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔ شاید اسے کسی نے بتا دیا تھا کہ وہ اے ایس پی بہرام ولید ہی تھا۔ البتہ لڑکے کے گال پر تھپڑ کا نشان واضح تھا۔ بہرام اس کے ڈرنے پر ہنس دیا۔ اس کا زور دار قہقہہ گونجا۔ مسکراتے ہوئے بہرام ولید قیامت انگیز منظر پیش کرتا تھا۔

☆~~~~~~~~☆

پیر کا دن پورے اسلام آباد میں بہت خوش گوار تھا۔ کل رات کافی تیز بارش ہوتی رہی تھی۔ موسم کافی اچھا تھا۔ آج اذلان اور عائشہ کو ایک ساتھ کافی پیشنٹس کو چیک کرنا تھا۔ اسلام آباد کی مارکیٹ میں گیس کا سلنڈر پھٹنے کی وجہ سے آگ لگ گئی تھی۔ جس کے پیش نظر شہر کے تمام ہاسپٹلز میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی۔ اذلان اور عائشہ کی ڈیوٹی بھی کافی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سارا دن وہ دونوں ہاسپٹل کے باقی ڈاکٹروں کے ساتھ مل کر وہاں لوگوں کا علاج کرتے رہے تھے۔ رات کے 12 بجے کے قریب وہ فری ہوئے تھے۔ عائشہ آفس کے اندر ہی رکھی کرسی پر آنکھیں بند کیے گہری نیند میں تھی۔ وہ کافی انکنفرٹیبل طریقے سے سوئی ہوئی تھی۔ سر ٹیبل پر ٹکائے وہ گہری نیند میں تھی۔ اذلان جب فارغ ہو کر آفس میں آیا تو عائشہ کو ایسے سوتے دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ ان انکنفرٹیبل تھی اذلان کو اچھا نہیں لگا۔ آفس میں مزید کوئی اور جگہ سونے کے لیے نہیں تھی۔ صرف ایک اذلان کی کرسی ہی تھی۔

اذلان نے وہ کرسی عائشہ کے پیروں کی سمت رکھی۔ اسے سمجھ نہ آیا وہ اس کے پاؤں اوپر کیسے رکھے۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے باہر سے ایک نرس کو بلایا۔

"آپی صبا۔۔عائشہ کے پاؤں دوسری کرسی پر رکھ دے۔ نیچے رہے تو پاؤں اکڑ جائے گے۔" اس نے صبا کو تاکید کی تو وہ مسکرا دی۔

" تو آپ کس پر سوئے گے اذلان ؟ " اس نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھتے پوچھا۔

" I'll adjust. " اس نے آرام سے کہا۔ صبا نے سر ہلا دیا۔ پھر عائشہ کی ٹانگیں دوسری کرسی پر اچھے سے سیٹ کر دیں۔ اب وہ تھوڑی کمفرٹیبل تھی۔ صبا چلی گئی تو اذلان نے عائشہ کا ڈاکٹر کوٹ اس کے اوپر ڈال دیا۔ وہ خود بھی کافی تھکا ہوا تھا۔ اسے سونا تھا مگر اپنی کرسی کو تو وہ عائشہ کے پاؤں کی زینت بنا چکا تھا۔ اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اپنا ڈاکٹر کوٹ زمین پر بچھایا اور اس پر لیٹ گیا۔ عائشہ کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے حیرت سے اس سارے منظر کو دیکھا۔ کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ وہ ہیلتھ منسٹر کا بیٹا تھا ؟؟ کیا کوئی یقین کر سکتا تھا کے ہیلتھ منسٹر کا بیٹا بغیر کسی شرم کے زمین پر سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ کیا کوئی وجہ بچتی تھی کہ اس کو رشک کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے؟ وہ مرد کسی کو بھی اپنا اثیر کر سکتا تھا۔ کیا واقعی وہ اتنا سادہ تھا ؟ کوئی پوچھتا سادگی میں حسن کیا تھا ؟ تو وہ بلا جھجک کہتی اذلان مصطفی۔

وہ آنکھیں بند کیے شاید سو چکا تھا۔ عائشہ اسے دیکھتی رہی۔ اس دن کے بعد ان کی دوبارہ شادی کے ٹاپک پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ کیا واقعی اسے فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس کا ماضی کیا تھا ؟ اسے تو صرف اس کے حال سے غرض تھا۔ ماضی تو " ماضی " تھا نہ۔ عائشہ صدیقی کو پہلی بار اس شخص سے عقیدت محسوس ہوئی۔ بے پناہ عقیدت۔ اسے آج بھی یاد تھا۔ ایک وہ شخص میر ہادی کو اپنے گھر کے حالات کے بارے میں بتا رہی تھی تو وہ کیسے اس کا مذاق بنا رہا تھا۔ اور ایک یہ شخص اذلان مصطفی تھا جو اس کا ماضی جاننے کے باوجود بھی اس سے شادی پر رضا مند تھا۔ ذہن سے خیالوں کی سکرین کب غائب ہوئی اور نیند نے اسے آن گھیرا عائشہ کو علم تک نہ ہوا۔

رات کے دو بجے کے قریب اذلان گہرے سانس لیتا نیند سے جاگا۔ اسے آج پھر خواب آیا تھا۔ اس کا پورا وجود خوف سے پسینے میں تر تھا۔ پھر اس کی نظر اپنے پاس بیٹھی پانی کا گلاس تھامے عائشہ پر گئی۔ شاید عائشہ اس کی خوفزدہ آواز سن کر اٹھی تھی۔ اس نے پانی تھاما اور پانی ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔ چند لمحے یوں بیٹھا رہا جب کچھ نارمل ہوا تو اوپر کرسی پر بیٹھ گیا۔ عائشہ اس کے پاس ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"اے ایم سوری۔۔میری وجہ سے آپ کی نیند بھی خراب ہوگئی۔" اس نے لہجے کو حد درجہ نارمل رکھتے ہوئے نظریں جھکائے کہا۔ نجانے کیوں اس کا چہرہ دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔

"محبوب سامنے ہو تو نظریں اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں اذلان۔" اس نے نرمی سے جواب دیا۔ اذلان اس کی نظروں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا میں۔۔آپ سے ایک پرسنل سوال پوچھ سکتا ہوں؟" اس نے التجا کی۔

"۔۔جی پوچھیں۔۔" عائشہ گہرا سانس لیتے کہا۔

"آپ نے مجھے جواب نہیں دیا۔۔کیا آپ مجھ سے شادی کرے گئی؟" اس نے کہا تو عائشہ نے الجھن سے اس کی جانب دیکھا۔ اسے اذلان مصطفی میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی۔ مگر وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے کچھ وقت چاہیے تھا مگر ہاجرہ بی شادی پر تلی ہوئیں تھیں۔ عائشہ یہ بات بھی جانتی تھی کہ اذلان نہیں جانتا اس کا رشتہ پہلے سے ہی عائشہ کے گھر آ چکا ہے۔ اس نے جھوٹ بولنا مناسب سمجھا۔

" کیونکہ میری پھوپھو نے میرا رشتہ کہیں فکس کر رکھا ہے۔ میں ان کی مرضی سے ہی شادی کروں گی۔ وہ بھی صرف اس سے جس سے وہ چاہے گئی۔" عائشہ نے رخ پھیرتے کہا۔ وہ تو گویا ساکت ہو گیا۔

" بس۔۔؟ اور کوئی وجہ نہیں ہے؟ میں انہیں منا لوں گا۔" اس نے جواب طلب سوال کیا تھا۔

" میں نے آپ سے کہا تھا اذلان میں ہادی سے۔۔ محبت کرتی ہوں۔ شاید اسے کبھی نہ بھلا سکوں۔ میں پوری کوشش کر رہی ہوں۔ مگر مجھے نہیں لگتا میرے لیے اس کو بھولنا ممکن ہے۔ میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔" عائشہ نے لہجے میں الجھن لیے کہا۔

" کیا کر سکتی ہیں آپ اس کے لیے؟ " شاید اسے امید تھی کہ وہ بات ٹال جائے گی۔ مگر اس کا اگلا جملہ سن کر اذلان مصطفی ساکت ہوا تھا۔

" میں اس کے لیے آپ کا قتل تک کر سکتی ہوں اذلان مصطفی۔" وہ ایسے بولی کہ گویا ابھی اس کا قتل کر دے گی۔

یہ الفاظ اذلان مصطفی کو زندگی میں ہی مار گئے تھے۔ یک طرفہ محبت تھی ، کوئی جرم تو نہیں ۔ جو اسے اتنی بڑی سزا مل رہی تھی۔ اسے لگا اس کا دل کسی نے نکال لیا تھا۔ پھر چند لمحے گزرے اذلان مصطفی کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ آئی۔ اور پھر۔۔ پھر اگلے جملے جو اذلان مصطفی کے لبوں سے ادا ہوئے تھے وہ عائشہ کو شل کر چکے تھے۔ ساکت۔ اسلام آباد کی ہواؤں نے دم سادھ لیا۔

" اذلان مصطفی آپ کے ہاتھوں اسی مسکراہٹ کے ساتھ مرے گا۔

اذلان مصطفی آپ کو اپنا قتل بھی معاف کر دے گا۔" کس اذیت سے اس نے یہ الفاظ کہے تھے یہ بس وہی جانتا تھا۔ وہ آفس سے باہر چلا گیا۔ باہر اس وقت بھی کافی لوگوں کا رش تھا۔ وہ بلڈنگ سے باہر نکل آیا۔ درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اذیت تھی کہ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا محبوب ظالم تھا اور وہ یہ بات جانتا تھا۔ پھر کیوں نہ اذیت دوگنی ہوتی ؟ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور ایک سنسان سڑک کے پاس گاڑی روک دی ۔ اسے خاموشی چاہیے تھی۔ وہ رو رہا تھا اور اسے علم تک نہیں ہوا تھا۔ صبح کے چار کب بجے اس علم نہیں ہوا ، سورج پورے آب و تاب سے سر اٹھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سوجی ہوئیں تھیں۔ نجانے کتنے گھنٹے گزرے تھے وہ مسلسل رو رہا تھا۔ یہ اذلان

مصطفی کے صبر کی آزمائش تھی۔ وہ اذیت کی انتہا پر تھا اپنا آپ اتنا بے بس ، بے وقعت آج سے پہلے کبھی نہیں لگا تھا۔ مگر اسے صبر کرنا تھا۔ اسے صبر کرنا ہی آتا تھا۔ وہ صبر سے کام لے گا۔ اس نے جود سے عزم کیا۔

إِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِينَ ○

وہ اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھے بار بار پڑھ رہا تھا۔

☆~~~~~~~~~☆

کراچی کا رخ کرے تو بیسمینٹ میں آج کسی اپنے کی جان جا رہی تھی۔ رحمان میز سے بندھا تھا۔ ہادی پاس کھڑا تھا جبکہ ایک ڈاکٹر رحمان کے سر پر کھڑا اوزار تیز کر رہا تھا یا یوں کہنا ٹھیک ہوگا کہ صرف اسے اذیت دینے کو اس کے سامنے یہ سب کر رہا تھا۔

" مجھے دھوکہ دیا تھا نہ تم نے رحمان۔ اچھا نہیں کیا۔" ہادی نے سگریٹ کے کش لیتے کہا۔

" سر۔۔۔ سر۔۔پلیز مجھے معاف کر دیں۔ میرے چھوٹے بچے ہیں۔ یوں نہ کریں۔ میں نے بس تھورے ہی پیسے لیے تھے۔" وہ رحم کی بھیک اس شخص سے مانگ رہا تھا۔

جس نے رحم کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ ہادی نے ڈاکٹر کو اشارہ کیا تو وہ اس کے آرگنز نکالنے لگا۔ اسے بے ہوش نہیں کیا تھا تاکہ وہ اذیت محسوس کر سکے۔ بیسمینٹ سے باہر آتے ساتھ ہادی نے ارسل کو فون کیا۔

" ارسل کہاں ہو تم؟ " وہ حکمیہ انداز میں بولا۔

" میں اسلام آباد جا رہا ہوں اذلان سے ملنے۔ " اس نے جواب دیا۔ ہادی کو مزید غصہ آیا۔

" فورا واپس آو اور عائشہ کو ڈھونڈ کر لاؤ مجھے وہ ہر حال میں چاہیے۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔" وہ وحشت سے بولا۔ بھلا جن سے محبت کی جائے انہیں مارا جاتا ہے؟ کراچی کی نم ہواؤں نے اس پر قہقہہ لگایا۔ کم بخت کہتا تھا محبت ہے۔ اب کہاں گئی یہ محبت؟

" ہادی میرے آدمیوں نے پورا کراچی چھان مارا ہے وہ کراچی میں نہیں ہے۔ اسے کہیں اور ڈھونڈو وہ کراچی میں نہیں ہے۔" ارسل نے اس کہا تو ہادی ساکت ہوا۔

" نہیں نہیں۔۔کراچی سے باہر نہیں جا سکتی وہ۔۔اس نے کبھی کہیں اور جانا چاہا ہی نہیں۔" وہ الجھ کر بولا۔

'' اچھا میں کوشش کرتا ہوں۔ تم غصہ مت کرو یار۔۔مل جائے گی وہ۔'' ارسل نے گویا سر سے بلا اتاری۔ اس نے پہلے دن سے ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ورنہ عائشہ کو ڈھونڈنا کون سا مشکل تھا۔ جس جس یونیورسٹی میں اس کا نام میرٹ پر آیا تھا وہ وہاں دیکھتا تو دنوں میں مل جاتی عائشہ۔ بات تو یہ تھی کہ ارسل کو عائشہ سے ہمدردی تھی۔ وہ جانتا تھا ہادی نے غلط کیا تھا۔

فون بند ہوا تو ہادی نے گہرا سانس لیا۔ غصے پر کنٹرول کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اسے نفرت تھی عائشہ سے یہ اعتراف وہ جب سے گئی تھی تب سے خود سے کر رہا تھا۔ ہادی کے نفرت کی زنجیر اتنی بری طرح سے بندھ چکی تھی کہ اسے توڑنا نا ممکن تھا۔ وہ شخص جس کے ہاتھ میں نجانے کتنے ہی لوگوں کی زندگیوں کی زنجیریں تھیں ، جس نے آج تک کتنی ہی زندگیوں کو اپنی زنجیروں میں قید رکھا تھا۔ وہ شخص آج خود نفرت کی زنجیر میں بندھ چکا تھا۔

'' عائشہ کیا بات ہے ؟ رات کے دو بج گئے ہیں کیچن میں کیا کر رہی ہو؟ '' ہاجرہ بی نے اسے دیکھ کر پوچھا وہ کیچن کے اندر کرسی رکھے بیٹھی گہری سوچ میں کھوئی تھی۔

'' کچھ خاص نہیں۔۔بس وہ۔۔'' عائشہ نے کہا تو آنسو ضبط توڑنے لگے۔

'' کیا بات ہے عائشہ؟ '' وہ پریشان سی اس تک آئیں۔

'' کل میں نے۔۔اذلان سے۔۔کہاں کہ میں ہادی کے اس کا قتل کر سکتی ہوں۔۔تو پتا ہے اس نے کیا کہا؟ '' وہ نم آنکھوں سے مسکرائی آنسو پھر بہنے لگے۔

'' اس نے کہا۔۔وہ مجھے اپنا۔۔قتل بھی۔۔معاف کر دے گا۔۔'' وہ اونچی اونچی رونے لگی۔ ہاجرہ بی نے اسے تھام لیا۔

'' میں۔۔اتنی بری ہوں۔۔وہ میرے لیے یہ سب کیوں کر رہا ہے۔۔وہ۔۔مجھے ڈیزرو نہیں کرتا۔۔۔اپ سن رہی ہیں۔۔وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔۔'' عائشہ نے ہچکیوں سے روتے کہا۔

'' وہ نیک ہے۔۔اس کے چہرے پر رب کا نور ہے۔۔۔میں تو بہت گناہگار ہوں۔۔پھر وہ کیوں۔۔ مجھ سے محبت کرتا ہے۔۔میں تو اسے بدلے۔۔میں محبت بھی نہیں دے سکتی۔۔میں نے تو ہادی کو۔۔اپنے باپ کا قتل معاف نہیں کیا۔۔۔تو پھر وہ کیوں مجھے اپنا قتل بھی معاف کر رہا ہے۔۔کیوں۔'' وہ رونے لگی مزید کچھ بولا نہ گیا۔ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ اس نے آنسو صاف کیے تو وہ پھر سے بہہ گئے۔

'' مجھ پر اعتبار رکھو عائشہ۔۔میں جو کروں گی تمہارا بہتر کروں گی اوکے؟ تم میرے کہنے پر اس سے شادی کر لو۔ وہ تمہارے سارے مسائل دور کر دے گا۔۔مجھے یقین ہے۔'' وہ

اسے سمجھا رہیں تھیں ماں بن کر۔۔ماؤں کا اتنا حق تو ہوتا ہے نہ کہ وہ اپنے بچوں کا اچھا سوچ سکیں۔ عائشہ نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ان کی گود میں سر رکھے خود کو کتنی ہی دیر نارمل کرتی رہی۔

☆~~~~~~~~~~☆

ہوسٹل میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ اذلان اپنے کمرے میں بیٹھا مصروف سا اپنے کپڑے الماری میں رکھ رہا تھا۔ عشاء کی اذان ہوئی تو اس کے ہاتھ تھم گئے ۔ وہ واش روم میں آیا تو شیشے میں اس کا چہرہ واضح ہوا۔ شہد رنگ آنکھیں رونے کے باعث سوجی سوجی سی لگتی تھیں۔ سیاہ شلوار قمیض میں ملبوس وہ مرد شاید اپنی نمازوں میں آج کل کسی کا طلب گار تھا۔ وضو کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا اس کی دعائیں قبول ہو گئی یا نہیں۔ بس ایک اندھا اعتماد ، جو اسے اپنے رب پر تھا۔ اسے یقین تھا اللہ اس کی دعا سن لے گا۔ وہ تو کن کا مالک تھا۔ کن کہے گا تو کچھ بھی ہو جائیں گا۔ اور اذلان مصطفی کو اس کے کن کا انتظار تھا۔ بھلے ہی اس کن کو کئی سال لگ جاتے ۔ وہ انتظار کر سکتا تھا۔

کہتے ہیں محبت کا آخری مقام موت ہوتی ہے۔ لیکن کیا محبت کا آخری مقام کسی کو اپنی دعاؤں کا حصہ بنا لینا نہیں؟

اس نے گہرا سانس لیا سوچوں کے تسلسل کو توڑا اور وضو کرنے کے بعد وہ ہاسٹل سے باہر آگیا۔ وہ قدم قدم چلتا فیصل مسجد کی جانب جا رہا تھا۔ نماز میں کھڑے ہوتے اس نے نیت باندھی۔ مولوی عبدالحق نماز پڑھانے میں مصروف تھے۔ نماز میں سجدہ زیر ہوتے آیات پڑھتے انسان کو اپنی اوقات پتا لگ ہی جاتی ہے۔ ہم جتنا بھی اپنے رب سے دور بھاگ لیں۔ ہمیں لگتا ہے اللہ ہم سے دور ہو گیا ہے جبکہ اللہ تو وہیں موجود ہوتا ہے ہر وقت ، دور تو ہم چلے جاتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ ہمیں ہماری نیکیوں اور برائیوں کے باوجود بھی ہمارے منہ رزق کے نوالے ڈال رہا ہے۔ اذلان مصطفی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ۔ اس کے ہاتھ لرزش کا شکار تھے۔آنکھیں نم تھیں۔ مولوی صاحب نے اس شخص کو غور سے دیکھا۔ نمازی کب کے جا چکے تھے۔ مگر وہ کتنی ہی دیر سے ہاتھ پھیلائے ، بغیر دعا مانگے رو رہا تھا۔

" یا اللہ --- مجھے آج بھی یاد ہے جب میں نے قرآن میں پڑھا تھا

" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟ (سورۃ الاعراف 7 : 172)

تو پھر تم کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کر ؟ (سورة التکویر 26 : 81)

کیا یہ دنیا تمہیں مجھ سے زیادہ عطا کر سکتی ہے؟ کیا تم دیکھتے نہیں روز تمہارے گناہ میرے پاس آتے ہیں۔ پھر بھی میں دوسرے دن تمہیں فرشتوں کے ہاتھوں رزق عطا کرتا ہوں۔" یا اللہ۔۔تو بڑا رحیم ہے۔۔تو بڑا کریم بھی ہے۔۔میں تیرے علاوہ کسی نے کن کا محتاج نہیں ہوں۔ یا اللہ۔۔اگر وہ میرے حق میں بہتر ہے تو اسے مجھے عطا کر دے۔ میں اس مرض سے آزادی چاہتا ہوں۔ " وہ اونچی اونچی رو رہا تھا۔ گڑگڑا رہا تھا۔ مولوی صاحب حیرت سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر اس کے پاس آئے۔

" بیٹا۔۔مت رو۔" انہوں نے اذلان کو اپنے سینے سے لگایا۔ وہ ان کے ساتھ لگا کتنی دیر روتا رہا۔

"آئے لو ہر۔ آئے رئیلی لو ہر۔۔" وہ روتے روتے بولا۔

" جا میرا بچہ۔۔گھر جا۔۔اس رب نے تیری سن لی۔" وہ اس اٹھاتے بولے۔ اس کے آنسو صاف کیے۔ وہ مسجد سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔

" مولوی صاحب نے اسے یہ کیوں کہا کہ رب نے اس کی سن لی؟ " ایک لڑکے نے اس کی جانب دیکھتے کہا۔

'' بھائی۔۔دس سال سے فیصل مسجد میں امامت کروا رہا ہوں۔ آج تک کسی کو۔۔خاص طور پر کسی نوجوان مرد کو اس طرح ایک عورت کے لیے روتے نہیں دیکھا۔ کاش وہ رب اس کی خواہش کو کن بنا دے۔'' وہ بے بسی سے اس مرد کو دیکھتے بولے جس کا رخ اب ہوسٹل کی جانب تھا۔

اذلان ہوسٹل میں واپس آیا تو اس کا فون ٹیبل پر پڑا تھرتھرا رہا تھا۔ اس نے نمبر دیکھا، نمبر سیو نہیں تھا۔ اس نے کال اٹھائی۔۔۔اور۔۔معجزے ہونے میں کتنی ہی دیر لگتی ہے؟ خدا کے کن کہنے میں کتنی ہی دیر لگتی ہے؟

'' کتنے محتاج ہے نہ ہم اس رب کے کن کے، پھر اتنا غرور کیوں اے انساں؟ ''

اللہ نے زنا سے روکا، ہم نے کلب بنا لیے۔

اللہ نے سود سے روکا، ہم نے بینک بنا لیے۔

اللہ نے جوئے سے روکا، ہم نے جوئے کے اڈے بنا لیے۔

اللہ نے شراب سے روکا، تو ہم نے میخانے بنا لیے۔

اللہ نے پردے کا حکم دیا، ہم نے ٹک ٹاک اور انٹرنیٹ پر مجرے شروع کر دیے۔

اللہ نے کہا کامیابی قرآن پڑھنے میں ہے ، ہم نے آکسفورڈ کی کتابوں میں کامیابی ڈھونڈنا شروع کر دی۔

اللہ نے کہا حاکم کو اپنے حکم کا حساب دینا ہوگا ، ہمارے حاکموں نے غریبوں کے گھر ڈھانے شروع کر دیے۔

اللہ نے کہا رشوت والا ہاتھ جہنم کا ایندھن ہے ، ہم نے ہر چھوٹے بڑے کام پورے کرنے کے لیے رشوت کو اس میں شامل کر لیا۔

ہم نے کتنا کچھ اس رب کے حکم خلاف کیا۔ پھر بھی اللہ نے روز ہم تک ہمارے رزق پہنچایا۔ ہمارے لیے کئی جگہ کن کہا۔ ہمیں کبھی بھوکا سونے نہیں دیا۔ پھر بھی اتنی اکڑ کس بات کی ہے اے انساں ؟

☆~~~~~~~~☆

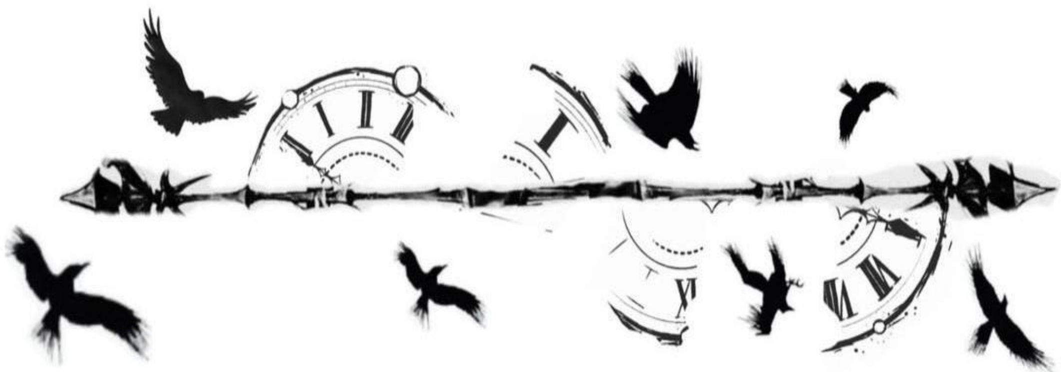

باب 6:

~ بے نقاب ~

کیا کرتے ہو ؟

" انتظار۔"

کس چیز کا ؟

" معجزوں کا۔ "

معجزے ہوتے ہیں؟

" ہاں بلکل۔"

اچھا بتاؤ کب ہو گا معجزہ؟

" جب میرا اللہ چاہے گا۔"

اور اللہ کب چاہے گے ؟

" جب میرے حق میں بہتر ہو گا۔"

اتنا یقین ہے ؟

" ہاں سب سے زیادہ۔"

پھر یہ آنکھوں میں آنسو کیسے ؟

" یہ تو بس ثبوت ہے کہ خدا کا بندہ بہت کمزور ہے اور اس کے کن کا محتاج ہے۔"

بہرام اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ فون ہاتھ پکڑے وہ گہری سوچ میں تھا۔ اسے عائشہ کے نمبر پر کال کرنی تھی۔ مگر وہ پریشان تھا۔ وہ عینی شاہد تھی ، ہادی کے خلاف دیا گیا عائشہ کا ایک بیان اسے زمین پر گرا سکتا تھا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے فون ملایا۔

" ہیلو۔۔" سوئی سی لڑکی کی ایک آواز فون کے دوسرے جانب سے گونجی۔

" ہیلو۔ میں کراچی پولیس سٹیشن سے اے ایس پی بہرام ولید بات کر رہا ہوں۔" اس نے اپنی پروفیشنل ٹون میں کہا۔ دوسری جانب سے عائشہ فورا اٹھ بیٹھی۔

" جی۔۔ بہرام ایمان کے ہسبنڈ ؟ " وہ کنفرم کر رہی تھی۔

" جی۔ تو آپ اتنی بھی بے خبر نہیں ہیں ایمان کے حوالے سے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

" ہاں ایک کالج فیلو سے پتا چلا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ آواز میں گلٹ تھا۔ اس کی وجہ سے ایمان کی پڑھائی ختم ہو گئی تھی۔ اس کی شادی ہو گئی تھی۔

" خیر۔۔ میں ان باتوں کی طرف نہیں جانا چاہتا اور آپ سے بھی یہی امید رکھتا ہوں کہ آپ میری بیوی کو اداس نہیں کرے گی۔ آج آپ کی بات گھر جا کر اس سے کروا دوں گا۔ ابھی مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔" اس نے سنجیدگی سے ہاتھ میں پکڑی فائل دیکھتے کہا۔

" میں کروں گی اپ کا کام آپ بتائیں۔ ایمان کے بہت احسانات ہے۔" وہ اداس سی بولی۔

" کیا آپ کراچی آ کر میر ہادی کے خلاف اپنا بیان ریکارڈ کروا سکتیں ہیں ؟ " بہرام کے الفاظ تھے اور وہ ساکت ہوئی۔

" میں؟۔۔ ہاں۔۔ ضرور آ جاؤں گی۔ چند ہفتے مصروف ہوں۔ دراصل میری شادی ہے اگلے چند ہفتوں میں۔۔اس کے بعد آ جاؤں ؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ لہجے میں میر ہادی کے لیے ایک بار بھی محبت نہیں آئی۔ اسے میر ہادی سے نفرت ہونے لگی تھی۔ کوئی اتنا گھٹیا کیسے ہو سکتا تھا کہ اتنے معصوموں کی جان لیتا۔

" جی۔۔چند ہفتوں تک آ جائیے گا کوئی مسئلہ نہیں۔ تب تک میں اس کے خلاف کچھ ثبوت بھی اکھٹے کر لوں گا۔" بہرام نے کہا اور کال کاٹ دی۔

چند لمحے گزرے تو ایک سپاہی نے آفس کا دروازہ ناک کیا۔

"آ جاو علی ۔" بہرام کی روب دار آواز آفس میں گونجی۔

" سر۔۔ جس لڑکی کو چند دن پہلے ہاسپٹل میں داخل کروایا تھا اسے ہوش آگیا ہے ۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے سلیوٹ کیا۔

" ٹھیک گاڑی تیار کروں میں پانچ منٹ میں باہر آتا ہوں پھر ہاسپٹل چلتے ہیں۔" بہرام نے حکمیہ کہا۔ جب علی چلا گیا تو اس نے ہاتھ میں پکڑی وہ موٹی فائل نیچے سیف میں رکھ کر اسے لاک کر دیا۔ فائل کر اوپر لکھا نام سیف کے اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ میر ہادی۔ وہ فائل بہرام نے میر ہادی کے خلاف تیار کی تھی تاکہ اسے کورٹ میں پیش میں کیا جا سکے۔

چند لمحے بعد بہرام ولید ہاسپٹل کے ایک کمرے میں ایک لیڈی انسپکٹر کے ساتھ کھڑا تھا۔

" جی کہیں کیوں ملنا چاہتی تھیں آپ مجھ سے ؟ نام کیا ہے آپ کا؟ " وہ اسے دیکھتے بولا۔

" میرا نام پلوشہ ہے۔ میں آپ کو میر ہادی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" وہ بیڈ پر سیدھی ہو کر بیٹھی۔

"آپ زخمی کیوں تھیں ؟ اور میر ہادی کو کیسے جانتی ہیں آپ ؟ " وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا ۔

" مجھے پاکستان سے سپین میں سمگل کیا گیا تھا۔ تقریبا ڈیڑھ سال پہلے۔ وہاں سے مجھے ایک انڈین کو بیچ دیا گیا۔ میں نے جہنم نما زندگی بسر کی ہے وہاں---اس کے بعد--مجھے واپس پاکستان کے ایک آدمی کو بیچ دیا گیا۔ اس نے مجھے--استعمال کر کے پھینک دیا۔ جب اس نے مجھے اس روڈ پر پھینکا تھا میں بہت زخمی تھی۔ اس کے دو دن بعد آپ نے مجھے ڈھونڈا تھا۔" وہ ساری تفصیل ایک آس سے بہرام کو بتا رہی تھی۔ شاید وہ--وہ غدار نہ ہو۔

" تو اس سب میں میر ہادی کہاں ہے؟ " اس نے سوال کیا۔ پلوشہ رو دی۔

" میر ہادی نے --ہی مجھے سپین سمگل کیا تھا۔ وہ لڑکیوں کو سمگل کرتا ہے میں نہیں جانتی تھی۔ وہ مجھ سے ایک کلب میں ملا تھا۔ چند ماہ ہمارے تعلقات رہے تھے۔ پھر ایک دن جب میں اس کے پینٹ ہاوس میں بے ہوش ہوگئ تھی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک کنٹینر میں تھی۔ " پلوشہ نے اپنے آنسو صاف کرتے بہرام کو بتایا۔

" کیا آپ یہ بیان کورٹ میں دے گئ مس پلوشہ ؟ " وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ پلوشہ نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ بہرام پچھلے چند دنوں سے میر ہادی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس سب کے دوران اسے ایک چیز نظر آئ تھی۔ کہ میر ہادی کے سارے کام ارسل دیکھتا تھا۔ میر ہادی کو آج کل محبت کا روگ لگا تھا۔ یہ اچھا موقع تھا اس کے خلاف بازی مارنے کا۔ سیاست دانوں کو ہارنے کے لیے ان کے کالے دھندوں کو میڈیا کے سامنے لانا پڑتا ہے۔ بہرام کو اب یہی کرنا تھا۔ارسل اور مصطفی ابراہیم پر گہری نظر بہرام کی ٹیم رکھ رہی تھی۔

☆~~~~~~~~~☆

" عائشہ آج جاب پر مت جانا۔" ہاجرہ بی نے اسے بیگ سیٹ کرتے دیکھا تو وہ بولیں۔

" لیکن کیوں ؟ آج تو بہت کام ہے وہاں۔" وہ مصروف سی بولی۔

" میں نے آسیہ کو بلایا ہے۔" وہ بولیں تو عائشہ نے انہیں دیکھا۔

'' ٹھیک ہے۔۔ نہیں جاتی لیکن آپ زیادہ جلدی شادی کی بات نہیں کرے گی نہ؟'' وہ انہیں جواب طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

'' عائشہ میں چاہتی ہوں شادی جلد از جلد ہو جائے۔ میں آسیہ بی سے بات کر چکی ہوں۔'' وہ حکمیہ بولیں۔

'' لیکن۔۔'' اس سے پہلے کے عائشہ کچھ بولتی ہاجرہ بی نے اس کی بات کاٹ دی۔

'' عائشہ میری بات مان لو۔ کر لو اذلان سے شادی ، میں نہیں جانتی میری عمر کتنی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ تم بے آسرا رہو۔'' وہ اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

'' ٹھیک ہے۔۔آپ پریشان نہ ہوں۔'' وہ بولی تو ہاجرہ بی نے سکھ کا سانس لیا۔

'' وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ مجھے یقین ہے۔۔تمہیں ہادی یاد تو نہیں آتا نہ؟ '' ہاجرہ بی نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔

'' یاد کا تو پتا نہیں پر خیال ضرور آتا ہے ۔ مگر بات پتا ہے کیا ہے؟ اب احساس ہوتا ہے کہ وہ صرف میری ٹین ایج کی نادانی تھا۔ ایک ایسی نادانی جس کی میں نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ مگر اب مجھے ذرا فرق نہیں پڑتا کہ وہ کہاں ہے ، زندہ ہے یا مر گیا۔

اس شخص مرنے کے ہی قابل ہے۔ اس نے کتنے معصوم لوگوں کی جانیں لیں۔ میرے سامنے اعتراف کیا اس نے اور میں اتنی پاگل تھی کہ پھر بھی اسے یاد کرتی رہی۔ اس جیسا شخص تو اس قابل ہے کہ اسے جنازہ بھی نصیب نہ ہو۔" عائشہ اتنی نفرت سے بولی کہ ہاجرہ بی چند لمحے اسے یوں ہی دیکھتی رہیں۔ کیا یہ وہی عائشہ تھی جو میر ہادی کے لیے رویا کرتی تھی۔

" خیر۔۔جانے والا وقت جا چکا۔ اس وقت کچھ غلطی میری بھی تھی۔ مجھے تمہیں روکنا چاہیے تھا۔ " ہاجرہ بی اس کا ہاتھ تھامتی بولیں۔

"آپ کی غلطی نہیں ہے۔ شاید ایک ٹھوکر لگنی ضروری ہوتی ہے۔ تاکہ ہمیں سمجھ آسکے کہ کون ہے اللہ کہ سوا ؟ تاکہ ہمیں ہماری اوقات دکھائی جا سکے۔" وہ آنسو صاف کرتی بولی ہاجرہ بی کے گلے لگ گئی۔

دوپہر کے وقت آسیہ بی ، اذلان اور پروفیسر طارق ان کے گھر پر آئے تھے۔ اذلان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اذلان نے مصطفی اور ارسل کو کال کر کے بتایا تھا ۔ مگر انہوں نے اذلان کی سنی آن سنی کردی۔ جب اذلان کی مام کا انتقال ہوا تھا۔ اس نے اذلان ان سے کافی زیادہ بحث کر آیا تھا۔ اسے دکھ تھا کہ اس کا باپ ایک غیر عورت کے

ساتھ کمرے میں اس کی ماں کے خلاف باتیں کر رہا تھا۔ مصطفی ابراہیم اذلان سے بہت ناراض تھے۔ جب اذلان واپس اسلام آباد آیا تھا تو مصطفی ابراہیم نے اسے پیپرز بھجوائے تھے۔ وہ پیپرز عاق نامے کے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام جائیداد سے اذلان مصطفی کو عاق کردیا تھا۔ اذلان نے اس بات کو سر پر سوار نہیں کیا تھا۔ اسے ویسے بھی ان کے حرام کے کاروبار سے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ اب جب اذلان نے انہیں بتایا تھا کہ وہ شادی کر رہا ہے تو انہوں نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ البتہ ارسل نے آنے کی ہامی بھری تھی۔

اذلان کا دل خوف سے بھرا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا عائشہ ہادی سے محبت کرتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ عائشہ کو شاید اسے قبول کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ مگر وہ انتظار کرسکتا تھا۔

شام کا کھانا کھا کر وہ لوگ واپس گئے تھے۔ رشتہ پکا وہ کر چکے تھے۔ فیصل مسجد میں ہی ان کا نکاح جمعہ کو سادگی سے کر دیا جائے گا۔ ایسا طے کیا گیا تھا۔ رات کو عائشہ ہاجرہ بی کی گود میں سر رکھے ۔

"پتا ہے عائشہ میں نے دو دن پہلے اذلان کو کال کی تھی۔ تمہارے رشتے کے لیے اس سے بات کی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش رہا تھا اور پھر مجھے اس کے الحمدللہ کہنے کی آواز

آئی تھی۔ اس کے لہجے میں نمی صاف واضح تھی۔ شاید وہ مجھے محسوس نہیں کروانا چاہتا تھا مگر وہ رو رہا تھا۔ وہ خاموشی نہیں تھی ، وہ اس کے آنسو تھے جنہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ بس تمہارا ہے۔ جانتی ہو جو اگلے الفاظ اس نے کہے تھے ان کو سن کر مجھے عائشہ صدیقی کی قسمت پر رشک آیا تھا۔ میں نے کہا تھا نہ جس نے بھی اسلام آباد میں دل لگایا وہ خسارے میں ہے۔ میں غلط تھی۔ اذلان مصطفی نے تو تمہارے خسارے سمیٹ کر تمہیں خوشیاں دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کہا تھا۔۔

میں عائشہ کو صرف اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہوئے ہی زندگی گزار سکتا ہوں۔ میں اس کا انتظار کرسکتا ہوں دس منٹ ، دس سال ، اگلی دس زندگیاں بھی میں اس کے انتظار میں گزار سکتا ہوں۔" ہاجرہ بی نے اپنی آنکھوں میں نمی اترتی محسوس کی تو وہ مسکرا دی ۔ عائشہ غور سے انہیں سن رہی تھی۔ اس کی خود کی نیلی آنکھیں بھی نمی سے بھری ہوئی تھیں۔

اسے آج سمجھ آیا تھا اذلان اور ہادی کی محبت میں کیا فرق تھا۔ میر ہادی نے صرف محبت دعوے کیے تھے۔ مگر اذلان مصطفی نے کوئی دعوے نہیں کیے تھے۔ کئی ماہ اسے محبت بھری باتیں بھی نہیں کی تھیں۔ جب محبت کی تو فورا شادی بھی کرنی چاہی۔ میر ہادی کی محبت میں جنون تھا۔ اور جنون انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔ وہ تباہ ہو جاتی مگر آباد

نہ رہ پاتی۔ عائشہ اور اذلان کی محبت کی زنجیریں ٹوٹ چکی تھیں۔ جس کی زنجیریں باقی تھیں وہ میر ہادی تھا اور اس کی زنجیریں نفرت کی تھیں۔ نفرت زنجیروں کو توڑنا تب تک نا مکمن ہوتا ہے جب تک خود نہ توڑا جائے۔

تم عورت ہو۔۔

باہر نکلو تو چہرے پر حجاب ہو اور لہجہ اتنا تلخ جیسے تیزاب ہو۔

تم مرد ہو۔۔

تمہاری ہستی کا رعب اتنا تو ہو کہ پاس سے گزری ہوئی عورت بے خوف ہو۔

☆~~~~~~~~~☆

" سر آپ کیا واقعی ایسا چاہتے ہیں؟ " علی نے حیرت سے بہرام کی جانب دیکھتے کہا۔

" ہاں۔ پلوشہ کے بیان کو نیوز چینلز پر چلاوا دو۔ " بہرام نے مطمئن سا جواب دیا۔

" لیکن سر اگر اس نے اس بیان کے وائرل ہونے کے بعد پلوشہ کو نقصان پہنچایا تو؟ " علی نے بہرام کو سمجھانا چاہا۔

" اس کا انتظام میں کر چکا ہوں۔ اس کے روم کے باہر سپاہی کھڑے کیے تو ہوئے ہیں علی۔" بہرام نے کہا تو علی گہری سوچ میں کھو گیا۔

" سر۔۔ کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ پلوشہ کے پاس روز ایک نرس آتی ہے۔ مگر اس دن جب میں کھانا لے کر گیا تھا تب کوئی اور نرس اندر جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے میر ہادی جانتا ہے کہ پلوشہ آپ کے پاس ہے ۔" علی نے سوچتے ہوئے کہا۔

" اس نرس پر نظر رکھو۔ اگر کچھ غلط کرنا چاہے تو پکڑ کر تھانے لے لاو۔" بہرام اٹھا اور ریکارڈنگ کی ٹیپ اٹھا کر علی کو تھما دی۔

" ہر نیوز چینل اور ہر جگہ یہ بیان وائرل ہونا چاہیے۔" بہرام کہتے ہوئے اٹھا اور ہادی کی فائل کو دیکھتے ہوئے پوائنٹس نوٹ کرنے لگا۔ چند لمحے بعد بہرام ایک بڑے سے بوڈر کے سامنے کھڑا تھا۔ جس کے سینٹر میں میر ہادی کی تصویر پیوست تھی۔ بوڈر پر اور بھی کافی لوگوں کی تصویریں نصب تھیں جس میں ارسل ، عائشہ، رحمان ، مصطفی ابراہیم اور میر گیلانی کے ساتھ ساتھ تبسم کی تصویر بھی شامل تھی۔ وہ بہرام ولید تھا۔ کیس کو حل کرنے سے پہلے تمام شواہد اکٹھے کرتا تھا۔ اگر اس کے دشمنوں کو لگتا تھا کہ وہ کمزور ہے تو یہ ان کی غلطی تھی۔

بہرام ولید وہ شیر تھا جو قانون کے دائرے میں رہ کر شکار کرتا تھا۔

رات تک پلوشہ کے بیان کی ویڈیو ہر نیوز چینل پر گردش کر رہی تھی۔ ہر جگہ جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ بہرام کا نام بھی ہر جگہ گردش کرنے لگا تھا۔ لوگ میر ہادی کو نفرت سے یاد کر رہے تھے۔ اس کے نام کے پوسٹر اور تصویریں جلا رہے تھے۔ ایسی حالت میں میر ہادی کی مخالف پارٹی نے بھی داو کھیلتے ہوئے میر ہادی کی پرانی کلب کی ویڈیو وائرل کر دی تھی۔ اپنے پینٹ ہاوس میں بیٹھے میر ہادی کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کا بس نہ چلتا وہ بہرام ولید کو کاٹ کے رکھ دیتا۔ میر ہادی نے اسی نرس کو آج رات پلوشہ کو وہ زہریلہ انجکشن دے کر ختم کرنے کا آرڈر دے دیا۔ تاکہ پلوشہ اس کے خلاف کورٹ میں گواہی نہ دے سکے۔

" ارسل۔۔ کل کی میٹنگ بہرام ولید کے ساتھ ارینج کرو یا اسے کہو میرے پینٹ ہاوس آ جائے۔ میں بھی تو دیکھوں کس کھیت کی مولی ہے یہ بہرام ولید۔" ہادی نے سگریٹ کا کش لگاتے ارسل سے کہا جو اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

" اوکے میں بات کر کے بتاتا ہوں۔" ارسل نے کہا اور باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

" رکو ارسل۔۔یہی پر کرو اسے کال۔" ہادی نے کہا تو ارسل وہی ہادی کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ بہرام ولید کا نمبر ڈیپارٹمنٹ کی لسٹ میں سے نکالا اور کال ملائی۔ چند لمحے بل جاتی رہی پھر فون اٹھا لیا گیا۔

" ہیلو۔ میں ارسل بات کر رہا ہوں۔ بہرام ولید سے بات ہو سکتی ہے؟ " ارسل نے فون سپیکر پر لگا دیا۔ غلط کیا۔

" جانتا ہوں تم ارسل بات کر رہے ہو۔ شہر کے کتے پر نظر ہوتی ہے بہرام ولید کی۔" فون کے دوسری جانب سے قہقہہ گونجا۔ ارسل نے مارے ضبط کے مٹھی بینچ لی۔ جبکہ ہادی سگریٹ کے کش لگاتا غور سے سن رہا تھا۔

" میر ہادی تم سے کل ملنا چاہتے ہیں۔ پینٹ ہاوس آ جانا۔" ارسل نے حکمیہ کہا۔

" جانتے ہو انسان وہ واحد مخلوق ہے جس کا زہر اس کی زبان میں ہوتا ہے۔ اور بہرام ولید ایسے انسانوں کی زبان کھینچنا خوب جانتا ہے۔ جن کی زبان میں زہر کے ساتھ غداری بھری ہو۔" بہرام نے کچھ انداز میں کہا کہ ارسل ساکت ہوا۔۔وہ میر ہادی کو دھوکہ دے رہا تھا یہ بات بہرام کیسے جانتا تھا؟

" مطلب نہ سمجھو؟ تو پھر کل پولیس سٹیشن میں ہادی تم سے ملنے آئے گا۔ اپنی موت تیار رکھنا۔" ارسل نے بات گھما دی اور فون کاٹ دیا۔ ہادی غور سے ارسل کو دیکھ رہا تھا۔

" ہمارا بچپن کا ساتھ ہے ارسل۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ بہرام کا اشارہ جس طرف بھی تھا وہ جھوٹ ہو۔ ورنہ۔۔" ہادی نے ارسل کا کندھا تھپتھپایا اور کمرے سے باہر بڑھ گیا۔ یعنی بہرام ولید یہ بھی جانتا تھا کہ ہادی پاس ہی تھا۔ سو اس نے ایسی بات کہہ ڈالی جو شک ڈال دیتی۔

" ہادی۔۔ایسا کچھ نہیں ہے۔۔بہرام بس ہمیں لڑوانا چاہتا ہے۔" ارسل اس کے پیچھے باہر آیا اور صفائی پیش کرنی چاہی۔

" کتے کو اپنا خوف اور انسان کو اپنی ضرورت سونگھنے نہیں دیتے۔ ورنہ وہ دونوں آپ کو کاٹ سکتے ہیں۔" ہادی نے اس انداز میں کہا کہ ارسل یک دم شل ہوا۔ ساکت۔

" ہادی جمعہ کو میرے ساتھ جا رہے ہو نہ اسلام آباد اذلان کی شادی ہے۔ اور پھر اچھا موقع ہے ہم اسلام آباد کی مختلف جگھوں پر عائشہ کو تلاش بھی کر لیں گے۔" جب ارسل کی چوری پکڑے جانے کے قریب تھی تو اس نے میر ہادی کے دل کا درد چھیڑ ڈالا۔ ہائے یہ دوست۔۔دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ آپ کی کمزوریاں جانتے ہیں۔

" ٹھیک ہے۔۔چلے جائیں گے۔ " ہادی نے اس بار نرم لہجے میں کہا۔ وہ اس سے نفرت کا دعوٰی دار تھا تو پھر اس کے نام پر دل نرم کیوں پڑا تھا ؟ ہادی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ سگریٹ سیڑھیوں کے پاس پھینک دیا۔

اپنے کمرے میں آکر ہادی نے گہرا سانس لیا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ دیواروں کو تکنے لگا۔ اس کے سب اپنے اسے چھوڑ گئے تھے۔ جو باقی بچے تھے وہ غداری کر رہے تھے۔ پھر وہ ہولے سے بولا۔

" مجھے رات بہت پسند ہے اور جیسے جیسے صبح ہونے لگتی ہے پھر سے ایک خوف آتا ہے۔

کہ وہی دنیا داری۔۔

پھر مکاری۔۔

پھر اداکاری۔۔

پھر غداری۔۔ " ہادی نے آنکھیں بند کیں تو ذہن کی سکرین پر وہ نیلی آنکھیں رنگ بھرنے لگیں۔

" جب میں مر رہا ہوں گا نہ تو آخری خیال تم ہو گی پرنسیس۔" وہ ہولے سے بڑبڑایا اور ہادی کے موبائل پر ایک گانا ہولے ہولے چل رہا تھا پھر وہ گنگنانے لگا۔۔

"کہ مر کے بھی کسی کو یاد آئے گے۔۔

کسی کے آنسوؤں میں مسکرائیں گے۔۔

کہے گا پھول ہر کلی سے بار بار۔۔

جینا اسی کا نام ہے۔۔

کسی کی مسکراہٹوں پہ ہو نصار۔۔

کسی کا درد مل سکے تو لے ادھار۔۔

کسی کے واسطے ہو تیرے دل میں پیار۔۔

جینا اسی کا نام ہے۔۔"

☆~~~~~~~~~~☆

" یہ کیسا ہے ؟ " ہاجرہ بی نے ایک برائیڈل ڈریس عائشہ کے سامنے کیا ۔ آج وہ عائشہ کو لے کر مارکیٹ آئیں تھیں۔

" می می آپ کو جیسا بھی اچھا لگتا ہے لے لیں نہ۔۔" عائشہ نے لہنگا دیکھتے بولا۔ وہ لال لہنگا تھا اور بہت خوبصورت تھا۔

" تم نے پہننا ہے نہ تو تم بتاؤ۔" وہ بولیں اور مڑ کر دیکھا تو عائشہ ایک سفید جوڑے دیکھ رہی تھی۔ وہ برئیڈل میکسی تھی ۔ پوری سفید مگر کام گولڈن تھا۔ نیچے سے اس میں مختلف رنگ کے کام سے تیار کیے گئے پھول تھے۔ وہ پوری میکسی کو ایک روئل لوک دے رہے تھے۔ ہاجرہ بی نے مسکرا کر دیکھا اور پھر بولیں۔

" تمہیں اچھا لگ رہا یہ؟ ہم یہی لے لیتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولیں اور اس میکسی کی جانب آئیں۔ میکسی کی قیمت بہت زیادہ تھی۔

" رہنے دے کوئی بات نہیں جو آپ کہے گی وہی پہن لوں گی۔" عائشہ نے قیمت بھانپ کر جواب دیا۔

" ہمم۔۔ایسا کرتے ہیں کہ ابھی گھر چلتے ہیں اور کل میں واپسی پر ریڈ والا ڈریس لیتی آؤں گی۔" ہاجرہ بی نے عائشہ سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے سفید ڈریس اچھا لگا تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ہاجرہ بی کی جیب کا خیال نہ کرتی۔ پہلے

ہی ہاجرہ بی نے اپنی ساری زندگی عائشہ کی نام کر رکھی تھی۔ اتنے احسان تھے مزید کیا مانگتی؟

گھر واپس آ کر عائشہ نے یونہی ٹی وی آن کیا تو خبریں دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا۔ ہر نیوز چینل پر ایک پلوشہ نام کی لڑکی کا بیان گردش کر رہا تھا۔ جو میر ہادی کے خلاف تھا۔ عائشہ ٹی وی بند کر دیا اور رخ موڑ لیا۔ ہاجرہ بی نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

" اداس ہو؟ " ہاجرہ بی نے پوچھا تو وہ مسکرا دی۔

" نہیں تو۔۔اچھا ہے نہ وہ ایکسپوز ہو رہا ہے۔ یہی ہونا چاہیے تھا نہ۔۔سچ مجھے یاد آیا۔ مجھے بھی انسپکٹر بہرام نے کال کی تھی کچھ دن پہلے۔ " وہ بولی تھی ہاجرہ بی نے فورا اس جانب دیکھا۔ دل زور سے دھڑکا۔

" کیا کہا؟ " وہ خوف سے بولیں۔

" یہی کہ مجھے عدالت میں ہادی کے خلاف بیان دینا چاہیے ، اطراف کرنا چاہیے۔" وہ رخ موڑ گئی۔

" تو۔۔ تم نے کیا کہا؟ " وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئیں۔

" میں نے کہا اپنی شادی کے بعد دے دوں گی بیان۔" وہ یوں بولی جیسے فرق ہی نہ پڑتا ہو۔

" تمہیں منع کر دینا چاہیے تھا۔ ایسی چیزوں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی عائشہ؟؟ مرد کبھی بھی تھانے اور کچہری کے چکر کاٹنے والی عورتوں سے شادی نہیں کرتے۔" وہ غنچے سے بولیں۔

" مجھے بھی یہی لگتا تھا می می ۔ اسی لیے میں نے کل رات اذلان کو کال کر کے اس بارے میں پوچھا تھا۔" وہ پرسکون سی بولی۔

" تو۔۔۔تو اس نے تمہیں ڈانٹا نہیں؟؟ روکا نہیں؟؟ " وہ پریشان سی بولیں۔

اگر منظر کل رات کی کال کی جانب لے کر جایا جائے تو عائشہ کان سے فون لگائے اس ویٹ کر رہی تھی کہ وہ کب فون اٹھائے گا۔ چند لمحے بعد ہی فون اٹھا لیا گیا تھا۔

" اسلام وعلیکم۔" وہ نرمی سے بولی۔

" وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ ؟ " وہ بھی نرمی سے بولا۔ عقیدت اس کے لہجے سے جھلکتی تھی۔

''آپ مجھے ''آپ '' کیوں کہتے ہیں؟ '' وہ تفتیشی انداز میں بولی۔ وہ چند لمحے کچھ نہ بولا تو عائشہ نے پھر سے سوال کیا۔

'' اتنی انا ہے ؟ جواب بھی نہیں دو گے اذلان ؟ '' وہ بولی ۔ دوسری جانب سے وہ اس کی مسکراہٹ کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اسے محسوس کب کرنے لگی تھی اسے احساس ہی نہیں ہوا۔

''آپ کے معاملے میں اناؤں کا کوئی عمل داخل نہیں۔

آپ بس آپ ہیں۔ آپ کو سن کر دل میں دور دور تک بس محبت جنم لیتی ہے۔

شکایات مرنے لگتی ہیں۔ ضد کہیں اور ہجرت کر جاتی ہے۔

اور۔۔اور سکون کسی تناور درخت کی طرح روح کے صحن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔''

وہ اعتراف تھا ؟ اس شخص کی محبت کا اعتراف بھی کتنا پر نور تھا نہ ؟ چند لمحے وہ خاموش رہی۔

" میں نہیں جانتی مجھے آپ سے کب محبت ہوگی۔ مگر میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں اذلان میں کبھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گی۔ " وہ مسکرا کر بولی۔ مسکراہٹ نے تو دوسری جانب بھی بسیرا کیا تھا۔ کیا یہ عشق کا آغاز تھا ؟

" میں نے آپ سے کچھ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔" وہ چند لمحے بعد سنجیدگی سے بولی۔

" جی کہیں۔۔" لہجے میں نرمی اور ادب واضح تھا۔

" مجھے کچھ دن پہلے پولیس سٹیشن سے کال آئی تھی۔ وہ چاہتے ہیں میں میر ہادی کے خلاف عدالت میں بیان دوں۔ آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟ " وہ جواب طلب تھی۔

" نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر آپ جانا چاہتی ہیں تو ضرور جا سکتی ہیں۔" لہجے میں وہی چند پل پہلے والی نرمی اور ادب تھا۔ اس کا لہجہ ذرا بھی نہیں بگڑا تھا۔ عائشہ ک

و توقع تھی وہ اسے ڈانٹ کر منع کر دے گا۔۔۔لیکن۔۔

" نہیں ابھی نہیں جاؤں گی۔ شادی کے بعد آپ کے ساتھ۔۔" وہ مختصر سا بولی۔

" بہتر۔۔ جیسا آپ چاہیں۔" اس کہا۔ پھر چند لمحے بعد فون رکھ دیا گیا۔

حال میں واپس آو تو ہاجرہ بی حیران سی بیٹھی تھیں۔

" کیا سچ میں اس نے تمہیں نہیں ڈانٹا؟ " وہ حیرت سے عائشہ کو دیکھتی بولیں۔

" جن سے پیار کیا جائے ان کے فیصلوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ اور اذلان مصطفیٰ کو احترام کرنا خوب آتا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ اج کل وہ مسکرانے لگی تھی۔

وہ میر ہادی کو بتانا چاہتی تھی۔ کسی کا چھوڑا ہوا ہاتھ کوئی تھام لیتا ہے۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ جو اس محرم بن رہا تھا وہ اس کا احترام کرنا جانتا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ جو اس کا محرم بن رہا تھا وہ اس کی قدر کرنا جانتا تھا۔ وہ عائشہ کی خزاں میں بہار بن کر آیا تھا۔ اسے اذلان مصطفیٰ سے عطا کیا گیا جا رہا تھا۔ ہاں وہی جو اس کی عزت کرنا جانتا تھا۔ جو وعدے نبھانا جانتا تھا۔ جو سچ بولنا جانتا تھا۔

تم مرد ہو۔۔۔

تم خوبصورت ہو۔۔اگر تمہارے اردگرد کے لوگ تمہارے قول و فعل سے محفوظ ہیں۔

تم خوبصورت ہو۔۔اگر تم رشتوں کو نبھانا جانتے ہو پھر چاہے وہ خونی ہوں یا روحانی۔

تم خوبصورت ہو۔۔اگر تم درگزر کرنے کی اہلیت رکھتے ہو۔

تم خوبصورت ہو۔۔اگر تم عورت کی عزت کرنا جانتے ہو۔

تم خوبصورت ہو۔۔اگر تم اپنے نفس کو قابو رکھنا جانتے ہو۔

تم خوبصورت ہو۔۔اگر تم اپنی زبان اور ہاتھوں سے دوسروں کو محفوظ رکھنا جانتے ہو۔

تک مرد ہو۔۔تم خوبصورت ہو !!

☆~~~~~~~~~☆

اگلے دن دس بجے کے قریب میر ہادی بہرام ولید کے آفس میں موجود تھا۔ بہرام ابھی تک نہیں آیا تھا۔ سیریسلی ؟؟ شاید وہ جان بوجھ کر لیٹ آئے گا۔ کتے انتظار کرتے ہیں شیر کا یار۔۔شیر نہیں کرتا نہ۔ سیاہ تھری پیس میں ملبوس میر ہادی ہمیشہ کی طرح خوفناک لگ رہا تھا۔ ہاتھ میں مہنگی رولیکس پہنے وہ شان سے بیٹھا تھا۔ چند منٹ بعد نیلی وردی والا اے ایس پی بہرام ولید کمرے میں داخل ہوا۔ وردی اس پر کافی سوٹ کرتی تھی۔ آہ ! اس کے ہاتھوں اور بازوں کی رگیں کافی نمایاں تھیں۔ بہرام اپنی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ چڑائے بیٹھ گیا۔

" جی کہیں میر صاحب کیوں تشریف لائے ہیں آپ ؟ " بہرام نے روب دار پروفیشنل ٹون میں کہا۔

" خیریت ہے ؟ بہرام نے مجھے چائے کا نہیں پوچھا۔" ہادی نے نرمی سے کہا۔ ہادی نے سوچا تھا کہ شاید بہرام بک جائے۔

" وہ کیا ہے کہ حکومت مجرموں کے لیے چائے کے پیسے نہیں بھیجتی۔" جواب ہادی کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

" سوچ سمجھ کر الفاظ نکالو بہرام۔ تم میر ہادی سے بات کر رہے ہو۔" وہ غصے سے بولا۔

" میر ہادی ! تم بہرام ولید سے بات کر رہے ہو۔ اور بہرام ولید مجرموں کو ان کے کیے تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے۔" بہرام بھی ویسے ہی غصے سے جواب دیا۔

" تمہیں مجھ سے دشمنی مہنگی پڑے گی بہرام۔" ہادی نے تنبیہ کیا۔

" انا پہ وار کے پھینکے ہیں ایسے ویسے بہت ، ہمارا غرور سلامت رہے تمہارے جیسے اور بہت۔" بہرام اس انداز میں بولا کہ ہادی غصے سے باہر نکل گیا۔

پولیس سٹیشن سے باہر آکر ہادی نے ارسل کو فون ملایا۔

'' بہرام ولید کا گھر تہس نہس کر دو ارسل۔ گھر میں جو بھی ہو اسے بھی مار دو۔'' ہادی نے حکمیہ کہا اور فون رکھ دیا۔

رات بہرام جس وقت گھر پہنچا سامنے ہی نظر آ گیا تھا کہ گھر کی حالت کافی بری ہو چکی تھی۔ ایمان اپنے بابا کے گھر پر تھی۔ بہرام کو اندازہ تھا کہ ہادی کچھ ایسا ویسا ضرور کرے گا۔ سو وہ پہلے ہی ایمان کو اس کے بابا کے گھر چھوڑ چکا تھا۔ البتہ اس کے گھر ہی حالت کافی خستہ حال چکی تھی۔ یہ بھی بہرام کے پلین کا ہی حصہ تھا۔ بہرام نے علی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

'' علی اب تک کی کیمرہ فوٹیج نکالا ۔'' بہرام نے سکون سے کہا۔ چند لمحے بعد علی کمیرہ کی فوٹیج لے آیا تھا جو گھر کے باہر لگا تھا۔ اس میں واضح دیکھا جاسکتا تھا کہ ارسل اور اس کے آدمی گھر کے اندر ہتھیاروں کے ساتھ داخل ہوئے تھے۔ گھر کی توڑ پھوڑ انھوں نے کی تھی اس کا بات ثبوت مل چکا تھا۔

'' چلو علی میاں۔ اب گھر کا جو جو حصہ سلامت ہے نہ اسے اچھے توڑ دو۔'' بہرام نے ہنستے ہوئے کہا۔ علی بھی مسکرا دیا۔

'' سر۔۔آپ سے تو خدا کی پناہ ہے۔ کیسے کیسے مجرم کو ذلیل کرتے ہیں آپ۔'' وہ میسنا سا مسکرایا اور گھر کے بچے حصے بھی توڑنے لگا۔ بھائی کورٹ میں بتانا تھا نہ کہ معصوم اے ایس پی کا سارا گھر توڑ ڈالا ۔ معصومیت؟؟ وہ تو بہرام ولید پر ختم تھی۔

'' کل ٹیم تیار رکھنا علی۔ ہمیں کلفٹن پارک میں گھومنے جانا ہے۔ خبر ملی ہے کل ارسل اور ہادی اسلام آباد جا رہے ہیں۔ تب تک اچھا موقع ہے ہمارے پاس اس جگہ کے راز کھوجنے کا۔'' بہرام کچھ سوچتے ہوئے بولا اور علی نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سے فرنیچر توڑنے لگا۔

'' سر میر ہادی کو آپ زہر لگتے ہیں۔ اگر آپ آفس سے نکلتے ہوئے اس کی شکل دیکھ لیتے نہ تو جان جاتے۔'' علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

'' تو مجھے کونسا وہ مینگو کا شیک کا لگتا ہے۔'' بہرام نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

'' سر جی جھانکنے۔۔'' علی نے ہنستے ہوئے کچھ اور کہنا چاہا تو بہرام نے اسے غصے سے گھورا۔

'' جھانکنے کی اصل جگہ اپنا گریبان اور رہنے کی صحیح جگہ اپنی اوقات ہوتی ہے۔ سو اسی میں رہو علی میاں۔'' بہرام کرسی سے اٹھا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔

"ایک تو سر کا موڈ دو سو کی سپیڈ سے بدلتا ہے۔" وہ بڑبڑایا اور پھر سے کام کرنے لگا۔
کام ہونہہ۔۔ کم بخت اپنے ہی گھر کا فرنچیر توڑا رہا ہے۔ پتا جو ہے عدالت کیس جیتنے پر اس سے اچھا گھر دے دے گی۔

زنجیر کبھی صرف لوہے کی کڑیوں کا نام نہیں ہوتی ۔ بعض اوقات یہ اعتماد، محبت، وفاداری، صبر اور اُن وعدوں سے بنتی ہے جو دو روحوں کو ایک دوسرے سے باندھتے ہیں۔ مگر ہر زنجیر کی موت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کچھ زنجیریں ایک زور دار ضرب سے ٹوٹ جاتی ہیں، لیکن کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو ہر گزرتے دن کے ساتھ خاموشی سے گھستی رہتی ہیں۔ ان کی ہر کڑی اپنے اندر ایک داستان چھپائے رکھتی ہے۔ کہیں بے توجہی کا زنگ، کہیں خاموشیوں کی دھول، کہیں ٹوٹے ہوئے وعدوں کی خراش اور کہیں ان کہے لفظوں کا بوجھ۔ یوں وہ آہستہ آہستہ اپنی طاقت کھونے لگتی ہیں، یہاں تک کہ ایک دن ایسا آتا ہے کہ انسان آہستہ آہستہ زنجیروں کو توڑنا سیکھ جاتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ اس رہائی حاصل کر لیتا ہے۔

وقت کبھی زنجیر کو نہیں توڑتا، وقت صرف یہ دکھا دیتا ہے کہ کون سی کڑی کتنی مضبوط تھی۔ اصل نقصان اُس لمحے نہیں ہوتا جب زنجیر ٹوٹتی ہے، بلکہ اُن بے شمار لمحوں میں

ہوتا ہے جب اسے توڑا جا سکتا تھا مگر توڑا نہیں گیا۔ کسی نے ہاتھ بڑھانا ضروری نہیں سمجھا۔ ہر نظرانداز کیا گیا احساس، ہر ادھورا جواب، ہر بے معنی خاموشی اور ہر جھوٹا یقین ایک نئی دراڑ بناتا ہے۔ لوگ اکثر آخری انجام پر حیران ہوتے ہیں۔ مگر اُنھیں یہ یاد نہیں رہتا کہ انجام ہمیشہ سینکڑوں چھوٹے زخموں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وہ انجام جسے ہمارے قانون کچھ سچے رکھوالے بے نقاب کرتے ہیں۔

"زنگ ہمیشہ باہر سے نہیں لگتا، بعض اوقات اندر کی نمی بھی لوہے کو کھا جاتی ہے۔"

ہمارے سسٹم میں کتنے ہی ایسے پولیس اہلکار ہے جو رشوت لے کر مجرموں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر کچھ ایسے بھی تو ہیں جو سچی لگن سے کام کر رہے ہیں۔ پورا تالاب گندا ہو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ ہر مچھلی زہریلی ہے۔ کچھ مچھلیاں ان زہریلی مچھلیوں سے کچھ الگ بھی تو کرنا چاہتی ہوں گی؟ جب زنجیر اپنی آخری سانسیں لے رہی ہوتی ہے تو وہ شور نہیں مچاتی، نہ کسی سے رحم کی بھیک مانگتی ہے۔ وہ صرف اپنی گرفت ڈھیلی کر دیتی ہے۔ جیسے تھک کر مان لیا ہو کہ اب سنبھالنے والا کوئی نہیں رہا۔ یہی خاموشی سب سے زیادہ خوفناک ہوتی ہے، کیونکہ چیخیں تو سنی جا سکتی ہیں، مگر خاموش ٹوٹنے کی آواز صرف

وہی سنتا ہے جو دل سے جڑا ہو۔ باقی دنیا تو صرف آخری لمحے کو دیکھتی ہے، اُس طویل سفر کو نہیں جس میں ہر کڑی نے اکیلے اپنا درد برداشت کیا۔

"سب سے بھاری بوجھ وہ ہوتا ہے جسے کوئی محسوس ہی نہ کرے۔"

☆~~~~~~~~~☆

فیصل مسجد میں آج معمول سے کچھ زیادہ رش تھا۔ جمعہ کا وقت ہونے کو تھا۔ مولوی عبدالحق کی امامت میں اذلان نے جمعہ پڑھا تھا۔ اذلان کے ساتھ اس کے یونیورسٹی کے کچھ دوست بھی موجود تھے۔ پروفیسر طارق نے بھی جمعہ کی نماز سب کے ساتھ ہی پڑھی تھی۔ جمعہ کے بعد نکاح کی جگہ سیٹ کی گئی تھی۔ میسم اور اذلان کے کچھ اور دوست جہاں نکاح ہونا تھا وہاں تھوری بیت ہیلپ کروا رہے تھے۔ دوسری جانب گھر کا منظر دیکھا جاتا تو ایک پالر والی عائشہ کو تیار کر رہی تھی۔ لائٹ سا میک اپ کیے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ چند منٹ بعد ہاجرہ بی کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کے ہاتھ میں عائشہ کا جوڑا تھا۔ عائشہ نے شیشے سے ان کی جانب دیکھا تو وہ حیران رہ گئی۔ہاجرہ بی نے وہی سفید جوڑا تھام رکھا تھا جو اس دن عائشہ کو اچھا لگا تھا۔

"یہ---یہ--" عائشہ نم آنکھوں سے ان کی جانب آئی۔

" تمہیں اچھا لگا تھا نہ؟ " ہاجرہ بی نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے بولیں۔ عائشہ نے انہیں گلے لگا لیا۔ وہ ایک عورت اس کے لیے بچپن سے لے کر آج تک کتنا کچھ کر چکی تھیں ۔ وہ اس کی ماں نہیں تھیں۔ وہ اس کی ماں نہیں تھیں۔ وہ اس کی پھوپھو تھیں اس کی می می۔۔۔ کون کہتا ہے پھوپھو بری ہوتی ہیں؟ اس کی پھوپھو نے تو اپنی تمام زندگی اس کے ساتھ اس کا سہارا بن کر گزاری تھی۔ عائشہ ان کو گلے لگائے رو رہی تھی۔

" بس کر کملی۔۔" ہاجرہ بی نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے کہا۔

" تھینک یو پھوپھو۔۔تھینک یو سو مچ۔۔ہر چیز کے لیے۔ عائشہ صدیقی آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں تھی اور نہ ہی کبھی کچھ ہو سکتی ہے۔" وہ پیار سے بولی۔ آنسو صاف کیے۔ آج عائشہ کو اما ابا بیت شدت سے یاد آئے تھے۔

چند منٹوں بعد مسجد میں کے اندر دو کرسیوں پر دو لوگ برجمان تھے۔ ان کے سینٹر میں سفید پھولوں سے بنائی گئی نما لڑیاں جھول رہیں تھیں۔ آنکھیں جھکائے اذلان مصطفی نے ایک بار بھی اس کی جانب نہیں دیکھا۔ یہی حال عائشہ کا بھی تھا۔ چند لمحے مزید گزرے تو نکاح شروع کر دیا گیا۔ مولوی عبدالحق نکاح نامے تھامے پاس ہی کرسی پر بیٹھے تھے۔ آس

پاس چند کرسیاں مزید لگیں تھیں جن پر اذلان کے کچھ دوست ، آسیہ بی اور ہاجرہ بی اور ایک جانب پروفیسر طارق برجمان تھے ۔

" اذلان مصطفی ولد مصطفی ابراہیم کیا آپ کو یہ نکاح عائشہ صدیقی ولد صدیقی حیدر کے ساتھ بہ عوظ حق مہر دو لاکھ روپے کیا جاتا ہے ۔ کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے ؟ " مولوی صاحب نے اذلان کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

" جی قبول ہے۔" تین مرتبہ دہرایا گیا۔ پھر اذلان نے نکاح نامے پر دستخط کر دیے۔ مولوی صاحب عائشہ کی جانب آئے اور پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔

" عائشہ صدیقی ولد صدیقی حیدر کیا آپ کو یہ نکاح اذلان مصطفی ولد مصطفی ابراہیم کے ساتھ بہ عوظ حق مہر دو لاکھ روپے کیا جاتا ہے ۔ کیا آپ کو یہ نکاح قبول ہے ؟ " انہوں نے پوچھا ۔

" قبول ہے ۔ ۔ " تین مرتبہ دہرایا گیا۔ مولوی صاحب نے نکاح نامہ اس کے سامنے رکھا۔ پچھلے چند سال اس کے ذہن کی سکرین پر رنگ بھرنے لگے ۔ ابا کی مار ۔ ۔ ہاجرہ بی کا پیار ۔ ۔ ان کا عائشہ کو ابا سے بچانا ۔ ۔ ۔ پرانا محلہ ۔ ۔ کالج ۔ ۔ ایمان ۔ ۔ ہادی ۔ ۔ اس سے آگے اس

نے سوچوں کو اختیار نہیں دیا۔ وہ شخص اس قابل نہیں تھا کہ اسے یاد کیا جاتا۔ پھر سائن کرتے وقت ہاتھوں میں لرزش کیوں تھی؟ اس نے سائن کر دیا۔

"آج عائشہ صدیقی کو تمام عمر کے لیے اذلان مصطفٰی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی ۔ یہ احساس کر احساس پر حاوی تھا۔"

اذلان اپنی کرسی سے کھڑا ہوا اور پھولوں کی لڑیوں کے پرے کرتے اس کے پاس آیا۔ اس نے عائشہ کا تھاما اور اسے کرسی سے اٹھایا۔ اذلان نے اس کا لال گھونگٹ اٹھایا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں شہد رنگ آنکھیں گھولنے لگیں۔ آج وہ اسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کی محرم بن چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کو وہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ عائشہ صدیقی کا محرم تھا یہ اذلان مصطفٰی کے لیے اعزاز تھا۔ اس نے اسے دیکھا۔ لائٹ میک اپ کیے ، نیلی آنکھوں میں کاجل لاگئے ، لال حجاب والی وہ دلہن اسے کسی اور دنیا سے آئی ایک پری لگی۔ سفید گولڈن کام دار میکسی جس کے نیچے مختلف رنگوں کے پھول بنے تھے۔ لال گھونگٹ والا دوپٹا اب سر پر تھا۔ اذلان نے پہلی بار اسے اتنے غور سے دیکھا تھا۔ حجاب اس پر بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہ اسلام کی شہزادی لگ رہی تھی۔ وہ اذلان مصطفٰی کی شہزادی لگ رہی تھی۔ ایک حور پری۔۔ہاں پری ہی تو تھی وہ ۔ اسے اپنا اور عائشہ کا ساتھ معجزہ لگا۔ کچھ

محبتیں معجزہ ہوتیں ہیں ۔ معجزہ ہی تو تھی ان کی محبت۔ ایک حسین معجزہ۔ عائشہ نے اذلان کو دیکھا۔ سفید شلوار قمیض پر سفید ہی واسکٹ پہنے جس پر کہیں کہیں گولڈن مردانہ کام تھا۔ بال آج ہمیشہ کی طرح بگڑے ہوئے نہیں تھے۔ انہیں جل لگا کر پیچھے کی سمت سیٹ کیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی رگیں کافی نمایاں تھیں۔ اس کے ہاتھ کسی بھی قسم کے بالوں سے پاک تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ عائشہ نے محسوس کیا وہ آج پہلی بار اسے اتنے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے وہ ایک حسین خواب کی طرح لگا۔ اسے وہ اس کی ہر زنجیر پر خوشیاں مارتا لگا۔ ہاں وہ اس کی زنجیروں پر خوشیاں مار آیا تھا۔ ظلمت کے سائے ڈھلنے لگے تھے۔ اجالے ہر سو چھانے لگے تھے۔

چند پل گزرے گھڑی پر ہلتی سوئیاں تک اسلام آباد کی ہواؤں میں ساکت ہوئیں۔ مسجد کے اندر دو لوگ بڑے مصروف سے انداز میں چلتے آگے آ رہے تھے۔ وہ تقریب والی جگہ پر پہنچے ۔ دور سے دلہا اور دلہن کو ایک ساتھ کھڑے دیکھا جاسکتا تھا۔ دلہن کا رخ دوسری جانب تھا۔ اذلان کو وہ دیکھ سکتا تھا جو شاید دلہن کی کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ میر ہادی اور ارسل چلے ہوئے ان تک آئے۔ ہاجرہ بی ساکت کھڑی رہیں۔ اذلان نے بتایا تھا ارسل اس کا بھائی تھا اور شادی پر ضرور آئے گا۔ مگر میر ہادی بھی آئے گا؟ یہ تو گمان بھی

نہیں تھا۔ ارسل نے اذلان کو گلے لگا کر مبارکباد دی اور اگلے ہی پل جیسے وہ مڑا اس کی نظر اس دلہن پر گئی۔ وہ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں ساکت ہوئے۔ ارسل نے حیرت سے دلہن کو دیکھا میر ہادی یوں ہی عام سے انداز میں اذلان سے ملا اور جب وہ مڑا تو ہواؤں نے دم سادھ لیا۔ ہر شے ساکت ہوئی۔ وہ جو دیکھ رہا تھا وہ خواب معلوم ہوا۔ عائشہ صدیقی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اذلان اس کے پیچھے اور میر ہادی ان دونوں کے درمیان میں ساکت کھڑا تھا۔ ساکت تو وہ بھی ہوئی تھی ہادی محسوس کر سکتا تھا۔ چند لمحے مزید گزرے تو عائشہ کی ایک حرکت نے اس کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ اذلان کے ساتھ جا کر کھڑی ہو چکی تھی اور عائشہ نے اس کا ہاتھ یوں تھام رکھا تھا جیسے میر ہادی کو بتا رہی ہو کہ دیکھو۔۔دیکھو کسی کا چھوڑا ہوا ہاتھ کوئی تھام لیتا ہے۔ جدائی کے یہ دو سال سرے سے غائب ہوئے۔ وہ میر ہادی جس نے دو سال اس سے نفرت کے دعوے کیے تھے ، وہ کہیں ہوا ہوئے۔ اس کی نفرت پہلے محبت اور پھر جذبات میں بہنے لگی۔ عائشہ اس کی سامنے کسی اور کی دلہن بن کر ، کسی اور کے حصار میں کھڑی تھی۔ اس نے اذلان کی جانب دیکھا جس نے عائشہ کا تھام رکھا تھا یوں جیسے۔۔ جیسے بتا رہا ہو کہ دیکھو۔۔دیکھو میں نے اسے تنہا نہیں چھوڑا ، میں اس کا حاکم نہیں بنا میں اس کا محافظ بن گیا ہوں۔ میر ہادی نے نظریں پھیر لیں، اب اسے اختیار نہ تھا کہ وہ اس دلہن کو

دیکھتا۔ وہ جو کہتا تھا کہ عائشہ کے سامنے آتے ہی اسے مار دے گا، وہ خود مر رہا تھا۔ میر ہادی وہ تھا جس نے رحم کرنا نہیں سیکھا تھا۔ اگر دنیا کی کوئی واحد شے اسے کمزور کر دیتی تھی وہ سامنے بیٹھی وہ لڑکی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر آخری بار عائشہ کو دیکھا۔ وہ اذلان کو عزت، مان اور۔۔۔ محبت سے دیکھ رہی تھی۔ میر ہادی کو لگا وہ سانس نہیں لے سکے گا۔ اس کی محبت پر تو اس کا حق تھا پھر یہ محبت بھری نگاہ اس پر کیوں نہ ڈالی گئی۔ جب جب وہ ہادی کو دیکھ رہی تھی اسے عائشہ کی نظروں میں اپنے لیے صرف نفرت نظر آ رہی تھی۔ وہ اذلان مصطفیٰ کو اپنی وفا دے رہی تھی۔ اس پر میر ہادی کا حق نہیں تھا؟ اسے تکلیف ہوئی۔ میر ہادی کو تکلیف ہوئی تو کلفٹن کی ہوائیں اسلام آباد میں آئیں اور انہوں نے استہزایہ ہنستے ہوئے میر ہادی کو دیکھا اور کہا "تکلیف محسوس کر میر ہادی، ہم نے بڑے لوگوں کی تکلیفیں اپنی ہواؤں میں محسوس کی ہیں۔"

میر ہادی کا وہاں سانس لینا مشکل ہوا۔ وہ جو ساری دنیا سے جیت گیا تھا، اپنی محبت سے ہار گیا تھا۔ اس نے قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔ ارسل سارے منظر کو حیرت سے تک رہا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور ڈرائیو کرنے لگا۔ موسم آبر آلود تھا بارش ہونے کے قریب تھی۔ اس نے گاڑی روڈ کے ایک جانب روک دی اور گاڑی سے باہر آیا۔ آج اس ظالم

بادشاہ کو بھی تکلیف ہو رہی تھی تو ہواؤں تک نے قہقہہ لگایا۔ آج پہلی بار میر ہادی کو احساس ہوا تھا کہ مکافات عمل کس شے کا نام ہے۔ وہ روڈ کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔ آنسو کب بہنے لگے اسے علم تک نہ ہوا۔ اسے لگا تھا کہ وہ سامنے آئے گی تو وہ اسے مار دے گا۔ مگر وہ سامنے آئی تھی تو وہ خود کیوں مر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بارش ہونے لگی۔ رات گہری ہوئی مگر جو شے نہیں روکی وہ میر ہادی کے آنسو تھے۔ وہ سنسان سڑک آج اس کے درد کی داستان اپنے اندر سما رہی تھی۔ وہ سڑک پر ہی سجدہ زیر ہو گیا۔۔اونچی اونچی ہچکیوں سے روتے ہوئے وہ پل پل مر رہا تھا۔۔یہی سجدہ وہ خدا کے روبرو کر لیتا تو کتنا ہی اچھا ہوتا نہ؟ نجانے وہ کتنے ہی گھنٹے روتا، بارش زور و شور سے برس رہی تھی وہ پورا بھیگ چکا تھا۔ رات کے تین بجے کے قریب بارش آہستہ آہستہ روکنے لگی۔

میر ہادی کے چہرے پر ایک پھیکی درد بھری مسکراہٹ ابھری۔ پھر اس نے چہرہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

محبت کا لفظ بہے بے کار لگتا تھا ہمیں جاناں

پھر ہوا کچھ یوں اک دن جاناں

جا رہے تھے ہم ایک میدان کھیل سے

نگائیں ٹکرائیں اور ہم دل دے بیٹھے جاناں

دل نے مان لیا وہ سادہ سا تھا اک احساس

کچھ دن گزرے تو جانا اک لفظ ہم نے

جسے کہتے تھے کچھ لوگ محبت جاناں

نگاہیں نہیں ملی دل ملے تھے جاناں

انکھ سے پھر اک ساون برسا تو جانا ہم نے

وہ جسے محبت سمجھ بیٹھے تھے ہم جاناں

وہ تو دوکھا تھا آنکھوں کا اک جاناں

محبت کا لفظ پھر سے لگنے لگا ہمیں بے کار جاناں!

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ ظلم کبھی دائمی نہیں رہا۔ جبر کے محلات کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں، ان کی بنیادیں ہمیشہ کمزور ہوتی ہیں، کیونکہ وہ انصاف پر نہیں بلکہ تکبر اور باطل پر کھڑی ہوتی ہیں۔ ظالم وقتی طور پر طاقتور دکھائی دے سکتا ہے، اس کے ہاتھ میں

اقتدار، دولت اور قوت ہو سکتی ہے، مگر اس کی طاقت صرف اُس وقت تک ہے جب تک اللہ کی دی ہوئی مہلت باقی ہے۔ جب اللہ کا فیصلہ آتا ہے تو وہی ہاتھ، جو کبھی مظلوموں پر اٹھتے تھے، بے بس ہو جاتے ہیں، وہی تخت جن پر غرور کیا جاتا تھا، مٹی میں مل جاتے ہیں، اور وہی زنجیریں جن سے انسانوں کے جسم اور روحیں باندھ دی گئی تھیں، ایک لمحے میں ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں۔ اس لیے مایوسی مومن کا شیوہ نہیں، کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ کی عدالت کبھی تاخیر تو کر سکتی ہے، مگر ناانصافی نہیں کرتی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہے:

﴿وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾

(سورة الإسراء 17:81)

ترجمہ:

"اور کہہ دیجیے حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔"

یہ آیت صرف ایک خبر نہیں بلکہ اللہ کا وعدہ ہے کہ باطل کی حقیقت ہی فنا ہے۔ وہ کتنا ہی طاقتور نظر آئے، اس کا انجام مٹ جانا ہے، جبکہ حق، اللہ کے نور سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ○ إِنَّمَا یُؤَخِّرُہُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْہِ الْأَبْصَارُ ○

(سورۃ إبراہیم 14:42)

ترجمہ:

"اور ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ ان کاموں سے بے خبر ہے جو ظالم کرتے ہیں، وہ تو انہیں صرف اُس دن تک مہلت دے رہا ہے جس دن خوف سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔"

یہ مہلت ظالم کی کامیابی نہیں بلکہ اللہ کی حکمت ہے۔ مظلوم کی ہر آہ، ہر آنسو، ہر صبر اور ہر خاموش فریاد اللہ کے علم میں ہے۔ اگر دنیا میں انصاف مکمل نہ بھی ہو، تو اللہ کی عدالت میں ایک ذرہ برابر ظلم بھی نظر انداز نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○

(سورۃ آل عمران 3:139)

ترجمہ:

"نہ کمزور پڑو اور نہ غم کرو، اگر تم ایمان والے ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔"

یہ غلبہ صرف جنگ کے میدان کا نہیں بلکہ حق، صبر، کردار اور انجام کا غلبہ ہے۔ تاریخِ انبیاء اس حقیقت کی روشن دلیل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا، مگر آگ ان کے لیے سلامتی بن گئی۔ حضرت یوسفؑ کو کنویں میں پھینکا گیا، پھر قید میں رکھا گیا، مگر آخرکار وہی مصر کے خزانے کے امین بنے۔ حضرت موسیٰؑ کے سامنے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر، مگر اللہ نے سمندر کو راستہ بنا دیا اور فرعون کو اسی کے غرور سمیت غرق کر دیا۔ یہ واقعات صرف قصے نہیں، بلکہ یہ اعلان ہیں کہ جب اللہ مدد کا فیصلہ کر لے تو آگ، سمندر، قید، زنجیر اور ظلم کوئی بھی اس کے حکم کے سامنے رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اس لیے اگر آج ظلم غالب دکھائی دیتا ہے تو یہ صرف منظر کا ایک حصہ ہے، پوری کہانی نہیں۔ ایمان رکھنے والا جانتا ہے کہ ہر اندھیری رات کے بعد صبح آتی ہے، ہر زنجیر ایک دن ٹوٹتی ہے، ہر فرعون اپنے انجام کو پہنچتا ہے، اور ہر مظلوم کی صدا ایک نہ ایک دن

قبولیت کا لباس ضرور پہنتی ہے۔ اللہ کی سنت یہی ہے کہ حق کو سربلند کرے اور باطل کو مٹا دے۔ اس لیے امید کو زندہ رکھو، صبر کو مضبوطی سے تھامے رکھو، کیونکہ ظلم کا خاتمہ یقینی ہے، زنجیریں ٹوٹنا یقینی ہیں، اور اللہ کا وعدہ کبھی خلافِ واقعہ نہیں ہوتا۔

☆~~~~~~~~☆

منظر کو اس رات پر لے چلیں تو رخصتی کے بعد اذلان عائشہ کے ساتھ بیٹھا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ عائشہ نے کو پیاس کا احساس ہوا تو اس نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھا۔ اذلان نے گاڑی کے ڈیش بوڈر میں پڑی پانی کی بوتل ایک ہاتھ سے کھولی اور دوسرے ہاتھ سے سٹیرنگ سنبھالا۔ پانی کھول کر عائشہ کے سامنے کیا وہ مسکرائی پھر پانی کے پینے لگی۔

" اذلان۔۔ایک بات کہوں؟ " وہ نرم سے لہجے میں بولی ۔

" دو کہیں ۔" وہ نرمی سے مسکرایا۔ اذلان نے اس کی نیلی آنکھوں میں اپنی شہد رنگ آنکھیں گاڑ دیں۔ چند منٹوں کے نکاح نے اسے کتنا بے باک کردیا تھا۔

وہ اس کا محرم تھا، اسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ اسے ہی تو دیکھ سکتا تھا، وہ اسے ہی تو دیکھ رہا تھا۔

''آپ کا شکریہ-- '' وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

'' کس لیے ؟ '' وہ اس کا تھام کر بولا۔

'' ہر چیز کے لیے--مجھے اپنانے کے لیے ، مجھے جج نہ کرنے کے لیے ، مجھے برا نہ سمجھنے کے لیے۔ ورنہ میں تو اس قابل ہی نہیں تھی کہ آپ کی دلہن بن سکوں۔'' وہ اداسی سے بولی۔

'' عائشہ غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ خود کو بے وقعت نہ سمجھیں۔آپ اتنی قیمتی ہے کہ اذلان مصطفی آپ پر اپنی تمام عمر کی جمع پونجی لٹا سکتا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا اور اس کے ہاتھ کو نرمی سے تھامے رکھا۔

چند لمحے گزرے تو اذلان نے گاڑی ایک دو منزلہ گھر کے باہر روکی۔ وہ گھر کافی مہنگا لگ رہا تھا۔عائشہ نے اذلان کو دیکھا اسے سمجھ نہ آئی۔

'' یہ کس کا گھر ہے؟ '' وہ تفتیشی انداز میں بولی۔ بیویوں والی تفتی

ش ہونہہ۔

"تمہارا۔" یک لفظی جواب دیا گیا اور عائشہ نے حیرت سے اس گھر کو دیکھا۔ اذلان گاڑی سے باہر آیا اور دوسری جانب سے اس کی سائڈ کا دروازہ کھول کر اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اذلان کا ہاتھ تھام کر باہر آئی۔ آنکھیں ابھی تک حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"اذلان۔۔ یہ گھر کیسے لیا آپ نے؟ اتنے پیسے کہاں سے آئے؟" وہ حیرت انگیز سی بولی۔

"بتایا تو تھا۔۔آپ اتنی قیمتی ہے کہ اذلان مصطفی آپ پر اپنی تمام عمر کی جمع پونجی لٹا سکتا ہے۔" وہ اس انداز میں بولا جیسے یہ عام سی بات ہو۔ عائشہ کی آنکھوں میں آنسو ابھرے پھر یک دم اس نے اذلان کو گلے لگا لیا۔

"تھینک یو۔۔تھینک یو سو مچ اذلان۔۔" وہ روتے ہوئے بولی ۔ وہ رو رہی تھی۔ پر بات یہ تھی کہ خوشی اور غم کے آنسوؤں میں فرق ہوتا ہے۔ وہ خوشی کے آنسو تھے اور اذلان مصطفی کو عزیز تھے۔ وہ اسے چپ کروانے لگا۔ چند لمحے گزرے تو وہ نارمل ہوئی۔ یہ اس کا گھر تھا یہ احساس بہت عظیم تھا۔

"اب صحیح بتائیں یہ گھر کس کا ہے۔" وہ مذاق کر رہی تھی۔ اذلان نے سوچنے والے انداز میں سر اوپر اٹھا کر گھر کو دیکھا۔

'' ویسے آپ اسے اپنی منہ دکھائی کا گفٹ بھی سمجھ سکتی ہیں۔ کیونکہ میں تو اب گنگلہ ہوں۔ اتنی ہی جمع پونجی تھی۔ '' وہ ہنس دیا۔

'' منہ دکھائی تو میں لوں گی۔'' وہ خفا ہوئی ۔ وہ اس سے خفا ہو سکتی تھی اور وہ اعتراض نہ کرتا۔ یہ احساس بھی حسین تھا۔

'' جان حاضر ، جیب۔۔نہیں حاظر۔۔'' وہ ہنس دیا۔ افف وہ ہنستے ہوئے کتنا خوبصورت لگتا تھا نہ۔ چہرے کے دونوں ڈمپل نمایاں ہوئے۔

چند لمحوں بعد وہ گھر کے لاونج میں تھے۔ ہر چیز سیٹ تھی ، عائشہ نے ہر کمرے کو دیکھا۔ وہ اس کا گھر تھا یہ احساس بہت خوبصورت تھا۔ لڑکیوں کا گھر اپنا ہو تو وہ کتنی مطمئن ہوتی ہیں نہ۔ کمرے میں اذلان وضو کر کے آیا تھا۔ عشاء کی نماز کا وقت ہونے کو تھا۔ عائشہ وضو کر کے کمرے میں آئی تو اذلان دو جائے نمازیں بچھا چکا تھا۔

'' کیا آپ میری امامت میں نماز پڑھیں گی؟ '' وہ مسکرا کر بولا۔

'' اس سے خوبصورت اور کیا ہو گا؟ '' وہ مسکرائی ۔ پھر دونوں نے نماز ادا کی۔

جو شخص آپ کی قسمت میں ہو وہ لاکھ رکاوٹوں کے بعد بھی آپ کو عطا کر دیا جاتا ہے اور جو شخص آپ کی قسمت میں نہ ہو، آپ چاہے لاکھ جتن کر لیں وہ آپ کو نہیں ملتا۔

" صحیح وقت پر ملنے والا انسان نصیب ہوتا ہے ، غلط وقت پر ملنے والا انسان امتحان ! "

☆~~~~~~~~~☆

بہرام اپنی ٹیم کے ساتھ کلفٹن پر موجود تھا۔ بہرام کو ملا کر وہ کل چار لوگ تھے۔ وہ گھنے درختوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے بنا آواز کیے پروفیشنل سے چل رہے تھے۔ ہاتھ میں پسٹل تھامے وہ سب چوکنے تھے۔ ایک گھنٹے تک تو وہ درختوں کے بیچ چلتے رہے۔ جگہ کافی بڑی تھی انہیں تلاش کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ پھر ایک جگہ وہ جب ساکت ہوئے۔ چند قدم آگے کچھ گارڈز کھڑے تھے۔ ان کے پاس ایک کونے میں بڑے بڑے نیلے ڈرمز رکھے گئے تھے۔ بہرام اور اس کی ٹیم ایک جگہ پر تھوڑا پیچھے ہی ٹھہر گئی۔ گارڈز زیادہ تھے ، وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ وہ ثبوت زور لے سکتے تھے۔ س نے علی کو اشارہ کیا۔ تو اس نے فورا موبائل نکالا اور منظر کو ریکارڈ کرنے لگا۔ چند لمحے بعد جو ہوا اسے دیکھ کر بہرام حیرت سے دیکھے گیا۔

زمین اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر بہرام کو اندازہ ہوا کہ وہ ایک بیسمینٹ کا دروازہ تھا۔ جس کے اندر سے ایک ویسا ہی گارڈ باہر آیا ۔ اس کے ہاتھوں میں کچھ مردوں کی کھالیں نما لاشیں تھیں۔ ان کے اندر سے تمام آرگنز نکال لیے گئے تھے۔ ان سب لاشوں کی حالت بد سے بدتر تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس گارڈ نے تمام لاشوں کو ان میں سے ایک بڑے ڈرم میں ڈال دیا۔ اس وقت بہرام کو اندازہ ہوا کہ ان ڈرمز میں تیزاب بھرا ہوا تھا۔ لاشیں چند لمحوں میں ہی تیزاب میں ڈی کمپوز ہو گئی تھیں۔ یہ منظر بہت بہت خوفناک تھا ، یہاں اگر کوئی عام شہری ہوتا تو یہ منظر دیکھ کر وہ ویسے ہی بے ہوش ہو جاتا۔ مگر وہ بہرام ولید اور اس کی ٹرین کردہ ٹیم تھی۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر وہاں ملک کی حفاظت کر رہے تھے۔ لوگ کتنی آسانی سے کہہ دیتے تھے کہ ہماری پولیس کچھ نہیں کرتی۔ جو کام وہ کرتے تھے اس کے لیے ایک جگرا چاہیے ہوتا تھا ۔ وہ صرف ایک منظر نہیں تھا ، نجانے کتنے ہی لوگ اس ظالم بادشاہ کے ہاتھوں اپنی جانیں گواہ چکے تھے۔ نجانے کتنی ہی لوگوں نے اپنے پیاروں کو کھویا تھا اور ان کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ ان بچے زندہ تھے یا مر گئے۔ بہرام کو حیرت کا جھٹکا اس وقت لگا جب کیمرہ میں مصطفی ابراہیم کا چہرہ ریکارڈ ہوا۔ وہ وہاں موجود ہر چیز ہینڈل کر رہے تھے۔ سب کچھ ریکارڈ ہو رہا تھا۔ ان کا چہرہ واضح کیمرے میں نظر آرہا تھا۔

وہاں موجود کچھ لوگ اب چھوٹی چھوٹی بے شمار کولینگ فریج کو روڈ کی جانب ٹرکوں کی طرف لے کر جارہے تھے۔ علی سارا منظر کیمرے میں ریکارڈ کر چکا تھا۔ چند لمحے مزید ریکارڈنگ کرنے کے بعد بہرام نے موبائل تھام لیا اور وہ سب جس خاموشی سے وہاں سے آئے تھے اسی خاموشی سے چلے گئے۔ بہرام نے پولیس سٹیشن میں آ کر اس ویڈیو کو ہر نیوز چینل پر بھیج دیا۔ پلوشہ کا بیان پہلے ہی آگ کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہ ویڈیو چند منٹوں میں ہی ہر جگہ پھیل گئی تھی۔ میر ہادی کی شناخت ایک دھبا بن گئی تھی۔

☆~~~~~~~~☆

ارسل ساری رات ہادی کو ڈھونڈتا رہا تھا۔ زبح آٹھ بجے کے قریب اسے ہادی مارگلہ کی سڑک کے پاس بے ہوش ملا ۔ ارسل فورا ہی اپنی گاڑی سے اتر کر آگے بڑھا مگر جب ہادی کو بے ہوش دیکھا تو وہ حیران ہوا۔ اپنی گاڑی کے آگے وہ بے سد پڑا تھا۔ شاید وہ ساری رات بارش میں بھیگتا رہا تھا۔ ارسل نے اسے اپنی گاڑی میں بیٹھایا ۔

" ہادی۔۔ہادی اٹھو۔۔" ارسل نے اس کا چہرہ تھپتھپایا۔ چند لمحے بعد وہ ہوش میں آیا۔ آنکھیں رونے کی شدت سے لال تھیں۔

" ہادی۔۔یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔" ارسل نے کہا تو ہادی نے اسے پرے دھکیلا۔

" یہ صاف کپڑے پہن لو۔۔" ارسل نے اسے اپنی ایک ایکسٹرا شرٹ اور پینٹ دی۔ چند لمحے بعد وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے کراچی کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے فلائٹ بک نہیں کی تھی۔ وہ بائے روڈ جارہے تھے۔

" بہرام نے بیسمینٹ کی ویڈیو وائرل کردی ہے۔ ہمارا بچنا مشکل ہے ہادی۔ " ارسل نے اسے بتایا تو وہ لاپرواہی سے سگریٹ جلانے لگا۔

" تمہارا باپ کہاں ہے ؟ " ہادی نے ارسل کی جانب دیکھتے بولا۔

" بابا اور میں آج 2 بجے کی فلائٹ سے لندن جا رہے ہیں۔ بزنس اور ریپوٹیشن تو بہرام نے گنوا دی ہے۔ جان نہیں گنوانا چاہتے۔" ارسل نے اطلاع دی۔ وہ جو میر ہادی سے ہر شے پوچھا کرتا تھا وہ اسے اطلاع کررہا تھا۔

" تو تم اور مصطفیٰ اتنے عرصے سے میرا پیسہ کھا کر لندن میں پراپرٹی بنا رہے تھے؟ " ہادی تلخ سا مسکرایا۔

" ہم نے۔۔ بھی اس سب میں تمہاری مدد کی تھی۔ حق کا پیسہ ہی لیا ہے۔۔" ارسل نے رخ موڑ کر کہا ۔ کبھی وہ اس کا گہرا دوست تھا۔ شاید یہ دوستی بھی ان کے کاروبار کی طرح کھوکھلی ہی تھی۔

" ویسے۔۔مجھے سچ میں نہیں پتا تھا کہ اذلان عائشہ سے شادی کر رہا ہے۔" ارسل۔نے صفائی پیش کی۔

" وہ میری کبھی تھی ہی نہیں میری ہوتی تو کسی اور سے نکاح نہ کرتی۔ شاید میں اس کے لیے ٹین ایج کی ایک غلطی سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا۔ " ہادی نے سگریٹ کے کش لگتا زخمی سا جواب دیا۔

" ہادی۔۔ تم کیا اتنی محبت کرتے ہو عائشہ سے؟ " ارسل نے اس کی جانب دیکھتے بولا۔

" اس نے میرے دل کو زنجیر سے باندھ رکھا ہے۔ اگر میں چاہوں تب بھی اس زنجیر کو توڑ کر آزاد نہیں ہوسکتا۔ یہ میر ہادی کے بس میں نہیں۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ دل میں درد کی ٹیس اٹھی۔ پھر وہ رونے لگا۔ وہ گاڑی میں کتنی ہی دیر روتا رہا آنکھیں سرخ ہونے لگی ۔ ارسل ڈرائیو کرتا رہا۔ اچھا تھا کہ وہ اپنے دل کا غبار نکال لیتا۔

" کیوں۔۔کیوں وہ میری نہیں۔۔کوئی اور۔۔۔وہ کسی اور کی کیسے ہو سکتی ہے۔" روتے روتے وہ غصے سے چیخا۔ اس کا رونا شدت اختیار کر گیا۔ ارسل نے آج تک کسی کو اتنا ٹوٹا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ جذبات تھے کہ ختم نہیں ہورہے تھے ، محبت تھی جو دل میں زنجیر

سے بندھ چکی تھی۔ اسے ایک عمر لگنی تھی اس زنجیر کو توڑنے میں، یہ عمر اس پر بھاری پڑنے والی تھی۔

وہ ایک شخص جو میری کہانی نہیں سمجھا

وہ میرے الفاظ میری زبانی نہیں سمجھا

اور اسے گلہ ہے کہ میں ایک قاتل ہوں

شاید وہ میرے اندر کی ویرانی نہیں سمجھا

جب وہ کراچی کی حدود میں داخل ہوئے تو ارسل ساکت رہ گیا۔ کراچی کی ہر سڑک پر لوگ جمع تھے۔ ہاتھ میں میر ہادی کے خلاف پوسٹرز پکڑے وہ نعارے لگا رہے تھے۔ یوں معلوم تھا کہ گویا پورا کراچی سڑکوں پر آگیا ہو۔ ارسل نے گاڑی سے باہر نکل کر دیکھا تو وہ۔ حیران رہ گیا۔ لوگ ارسل ، مصطفی اور ہادی کے پوسٹرز جلا رہا تھے۔ کچھ لوگوں کی نظر ارسل کی جانب اٹھی اور وہ گاڑی کی طرف غصے اور تپش میں بھاگے۔ ارسل جلدی سے گاڑی کے اندر بیٹھا ۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد گاڑی کی جانب لپکی۔ ہادی نے فورا دروازے لاک کرنے چاہے مگر اس سے پہلے ہی لوگ دروازہ کھول چکے تھے۔

ہادی اور ارسل دونوں کو گاڑی سے نکال لیا گیا تھا۔ لوگ ارسل کو بری طرح مار رہے تھے۔ ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ پولیس ایک جانب کھڑی تھی۔ لوگوں کا اتنے سالوں کا غصہ نکل رہا تھا پولیس کیا ہی کر سکتی تھی۔ ہادی کو لوگوں نے تھام رکھا اسے مار نہیں رہے تھے۔ وہ حیرت سے سار منظر دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میر ہادی کو موت سے خوف آیا تھا۔ دوسروں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے کو خود موت سے خوف آیا تھا۔ عدالت کی نوبت ہی بہرام ولید نے نہیں آنے دی تھی۔ وہ ایک کونے میں اپنی ٹیم کے ساتھ کھڑا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ البتہ اس نے پولیس یونیفارم نہیں پہن رکھا تھا۔ اس کی ٹیم بھی عام لباس میں ہی تھی۔

اگر منظر کو ایک دن پیچھے لے کر جایا تو بہرام ولید ویڈیو وائرل کرنے سے پہلے اپنے دفتر میں آکر بیٹھا تھا۔ چند لمحے بعد اس کا فون تھرتھرانے لگا۔

" یس سر۔۔" بہرام نے اپنی پروفیشنل ٹون میں کہا۔

" بہرام یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تم اپنی ٹیم کے ساتھ کلفٹن گئے تھے؟؟ منع کیا تھا نہ میں نے ۔ کہا تھا میر ہادی اور مصطفی کو اس کیس سے دور رکھو۔ ارے اتنی اوپر سے ان

کی سفارشات آ رہیں ہیں سمجھ کیوں نہیں آتا تمہیں؟؟ " ندیم قاسمی غصے سے بولے۔ وہ کراچی پولیس کے ہیڈ تھے۔

" سر وہ دونوں اس دھندے کو چلا رہے ہیں یہ صاف واضح ہے۔ میں انہیں چھوڑ نہیں سکتا ! " بہرام نے دبے دبے غصے سے کہا۔

" انہیں چھوڑ دو۔ It's my ORDER! " وہ غصے سے فون کے دوسری جانب غرائے۔ شاید وہ جانتے تھے بہرام کے پاس ثبوتوں کا ڈھیر لگ چکا ہے۔

" میں نہیں چھوڑوں گا۔ GO TO HELL YOU AND YOUR ORDER. " بہرام ولید انہی کے انداز میں چیخا۔ ادھار تو وہ اپنے باپ کا بھی نہیں لیتا تھا۔ پھر یہ تو ایک بوڑھا تھا۔ بہرام نے دل میں سوچا ۔

" میں تمہیں سسپینڈ کر دوں گا ! " وہ غصے سے بولے۔

" تو کیا سسپینڈ کرے گا مجھے جاہل ۔ جا میں نے رزائن کیا۔ " بہرام نے بڑا احسان جتا کر کہتے فون کاٹ دیا۔ پھر ویڈیو مختلف نیوز چینلز کو بھیج دی اور انٹرنیٹ پر بھی وائرل کر دی۔

موجودہ حال میں قدم رکھے تو لوگ ارسل کو مار رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی آخری سانسیں لینے لگا۔ وہ مرچکا تھا لوگ پھر بھی اسے مار رہے تھے۔ جب لوگوں کا تیش کم نہیں ہوا تو انھوں نے میر ہادی کو کراچی کی شاہراہ کے بیچ و بیچ ایک بجلی کے پول کے ساتھ باندھ دیا۔ اس طرح کے وہ پورا ہوا میں تھا۔ حکومت کی لا پرواہی کے باعث روڈ کافی ٹوٹا ہوا تھا۔ جگہ جگہ پتھر پڑے تھے۔ لوگوں نے پتھر اٹھا کر اس کے اوپر مارنے شروع کر دیے۔

وہ درد سے کراہ رہا تھا رو رہا تھا۔ اسے موت سے خوف آیا۔ اسے اللہ سے خوف آیا۔ درد سے چیختے چلاتے وہ تڑپ رہا تھا۔ اسی طرح جس طرح وہ لوگ تڑپا کرتے جنہیں وہ ظالمانہ انداز میں مارا کرتا تھا۔ اس سزا دینے کے لیے آخرت کا نہیں دنیا کا عذاب چنا گیا تھا۔ وہ لہو لہان ہو چکا تھا۔ لوگ نے پتھر مارنے بند کیے تاکہ دیکھ سکھے وہ زندہ تھا یا نہیں۔ اس کی آخری سانسیں چل رہیں تھیں۔ پھر اسے ہجوم میں " وہ " نظر آئی۔ وہی جس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ پھر اس کے ساتھ ایک مرد نظر آیا۔ ہاں وہی جو اس کا محرم تھا۔ میر ہادی کو اپنا درد دو گناہ بڑھتا محسوس ہوا۔ دل کا درد حد سے سوا ہوا۔ نیلی آنکھوں والی لڑکی نے جھک کر روڈ سے ایک پتھراٹھایا۔ پھر پوری قوت سے میر ہادی کے دل کے مقام پر دے مارا۔

" اسے آخری پتھر مارنے والی ، اس کی پہلی محبت تھی۔ پھر میر ہادی کا ہمیشہ کے لیے دنیا سے پردہ ہو گیا ، وہ مر چکا تھا۔"

مگر کسی نے اس کے لیے إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ تک نہیں کہا تھا۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھا۔ ظلمت کے اندھیرے جھٹ رہے تھے۔ ہر سو روشنی کی کرن پھیل رہی تھی۔

چند لمحے بعد یہ منظر پاکستان کے ہر نیوز چینل پر بریکنگ نیوز بنا ہوا تھا۔ لوگوں کا تیش اس قدر زیادہ تھا کہ مصطفی ابراہیم کو ائیر پورٹ سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ انہیں بیچ چراہے میں پھانسی کی سزا سنا دی گئی تھی۔ ہر شے بہت تیزی سے ہوئی تھی۔

ایک دن بعد کا منظر دیکھا جائے تو اسی سڑک کے دوسرے پول کے نیچے پولیس اہلکار مصطفی ابراہیم کی پھانسی کا پھندا تیار کر رہے تھے۔ موت کا خوف کسے نہیں ہوتا ؟ اور مجرموں کو تو موت کا خوف کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ مصطفی ابراہیم مارے خوف کے رو دینے کو تھے۔ لوگ ہجوم بنائے کھڑے سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ ظالم کے ہاتھ سے انصاف کا ترازو لے لیا گیا تھا۔ لینے والے عام لوگ تھے۔ کوئی دوسری دنیا کی طاقت نہیں، انصاف لینے کے لیے ظالم کے خلاف کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ خاموشی صرف ظلم کی شراکت داری ہوتی ہے۔ عوام خاموش نہیں رہی تھی اگر خاموش رہتی تو شاید کوئی کچھ بھی نہ کر پاتا اور یہ

نظام اگلی دس زندگیوں تک چلتا رہتا۔ مگر وہ خاموش نہیں رہے تھے۔ سو جیت کو ان کا مقدر بننا پڑا۔

اذلان مصطفی اور عائشہ صدیقی ایک کونے میں کھڑے تھے۔ اذلان کو باپ کا دکھ تھا مگر اذلان حق کے ساتھ کھڑا تھا۔ انہوں نے جو بویا تھا وہی کاٹ رہے تھے۔ اگلے چند منٹوں میں مصطفی ابراہیم کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ دوسرے پول پر ابھی تک میر ہادی کی لاش لٹکی تھی۔ یہ نشان تھا ہر اس ظالم کے لیے جو آج بھی کہیں نہ کہیں پاکستان میں موجود تھا کہ ہر ظلم کرنے والا کا انجام یہی ہوگا۔ پاکستان کے پرائم منسٹر نے اعلان کردیا تھا کہ ان کی لاشوں کا جنازہ نہ کیا جائے۔ ان کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو جنازہ نہیں ملا تھا۔ پرائم منسٹر نے ایک صحیح فیصلہ کیا تھا۔ پرائم منسٹر کون؟ وہی جس کو تصورات میں ہم قیدی نمبر 804 کے نام سے جانتے ہیں۔

ظلم پر خاموشی، ظلم کی شراکت داری ہوتی ہے۔ ہمارا ملک پاکستان ہر اس غلط ایجنڈے سے پاک ہوسکتا ہے۔ اگر ہم اپنی چپ کی زنجیر توڑ دیں۔ اگر ہم ہر غلط قانون کے خلاف آواز اٹھا کر ایک ساتھ اس کا مقابلہ کریں۔ مگر یہ تو تب ہی ممکن ہے جب ہم ایک ساتھ مل کر یہ سب کرے۔ ہمارے ملک کے ہر اس مجرم کو میر ہادی کے جیسی ہی سزا ملنی

چاہیے. جو ریپ جیسا ظلم کرے ، جو رشوت جیسا گناہ کرے ، جو غریبوں کا حق کھاتا ہو ، جو عہدے کے بل بوتے پر اس کا ناجائز استعمال کرتا ہو ، جو غیریبوں کی زمینوں پر بے جا قبضہ کرتا ہو ، جو قتل جیسا فعل کرتا ہو!! یہ سزا ہر اس مجرم کی پاکستان کے اندر ہونی چاہیے۔ جسے اسلام کے نام پر آزاد کروایا گیا تھا۔ پاکستان ایک عظیم ملک بن سکتا ہے اگر یہ سب کیا جائے۔ اگر بینکوں سے سود کو ختم کیا جائے ، اگر جہیز کی اس گندی رسم کو ختم کیا جائے ، اگر ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جائے ، اگر قاتل کو بیچ میدان میں پتھروں سے لہولہان کیا جائے ، اگر عدل کو قائم کیا جائے ، اگر پولیس سٹیشن میں رشوت کو سرے عام انجام نہ دیا جائے ، اگر ہر بد کو قانون خود ہی ختم کردے۔ تو کیوں نہ ہو گا عدل کا نظام قائم ؟ کیوں نہ ٹوٹے گئ وہ زنجیریں جو کب سے ہمارے ملک اعلی عہدیداروں نے عام عوام پہنا رکھیں ہیں۔ کیوں نہ ہو گا ملک ترقی کی راہ پر گامزن، گر جو عوام نکل آئے گئ بجلی کے بل ، گیس کے بل ، پنکھے کے بلوں کی ادائیگی سے تو کیوں نہ ہو گی ترقی پاکستان کی اس دہلیز پر اے انسان ؟ پلیٹ سجی سجائی تو نہ ملے گئ یہ ہر شے عوام کے نوجوانوں۔ خاموشی کی زنجیروں کو توڑنا ہوگا ، اپنے حق کے لے اواز اٹھانی ہوگی تو پھر کیوں نہ ہوگا امن کا گہوارہ ؟؟؟

"تجھے چلانے والوں سے ہزار گلے ہیں مگر

اے وطن !

واللہ ہمیں تم سے بے پناہ محبت ہے۔"

آخر میں یہ ناول پاکستان کے نام !

زنجیر کا کرب کیا کہوں الفاظ میں،

یہ قید ہے مگر دکھائی نہیں جا سکتی۔

یہ لوہے کی جکڑن نہیں،

یہ پتھر کی دیوار نہیں۔

یہ دل کے اندر بیٹھی ہوئی خاموش گرفت ہے۔

انسان کا وجود صدیوں سے اس میں الجھا ہے۔

کبھی رسموں کی صورت ،

کبھی خوف کے پردے میں ۔

کبھی خوابوں کو توڑنے والی صدا کی طرح ،

کبھی سوچ کے پر کاٹنے والی ہوا کی طرح ،

زنجیر وہی ہے جو آواز کو دبا دے۔

جو سوال کو جرم اور جستجو کو خطا بنا دے۔

یہ وہ بیڑی ہے جو پرندے کے پروں پہ رکھی ہو ،

مگر پرندہ اسے تقدیر سمجھ کر جی لے ۔

زنجیر توڑنے کے لیے ہمت درکار ہے ،

آنکھوں میں سچائی کی روشنی ، دل میں آگاہی کی جلن ۔

ورنہ ہزار سال کی غلامی بھی آسان لگتی ہے۔

کہ عادت کا نشہ ، آزادی سے زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔

اے انسان ! زنجیر کو پہچان ، ورنہ یہ تیری پہچان کو کھا جائے گی۔

تیری پرواز کو روک کر، تجھے زمین سے باندھ جائے گی۔

اے انسان ! پہچان اپنی اہمیت،

ورنہ یہ زنجیر تجھے نوچ جائے گی۔